شبیر حسن

دھوپ کے مُسافِر

شبیر حسن

دھوپ کے مسافر

افسانے

دھوپ کے مسافر

شبیر حسن

سنچیوری پبلیکیشنز

بہار اردو اکادمی کے مالی تعاون سے شائع شدہ

ISBN:978-81-920525-0-2

دھوپ کے مسافر

اشاعت اول : 2012

کور پینٹنگ : آرٹ ڈاٹ کام

ناشر : سنچیوری پبلیکیشنز، معرفت شہزاد، چھوٹی مسجد کے سامنے، نزد مدرسہ حسینیہ، تارنی پرساد لین، گھسیاری گلی، پٹنہ سیٹی، پٹنہ 800 008

طباعت : پاکیزہ آفسیٹ، شاہ گنج، پٹنہ 800 006

ملنے کے پتے : بک امپوریم، سبزی باغ، پٹنہ۔ 800004

بک کارنر، چوک بازار، مونگیر۔ 811201

Dhoop Ke Musafir
Short Stories by Shabbir Hassan

Published by Century Publications, Patna
Mobile: 9852850310/7870528295

Hard Bound: Rs. 250.00

اپنے عزیز بھائی

تنویر حسن کے نام

ترتیب

■

آئینہ

جاوید کے والد انجینئر تھے۔ ان کا تبادلہ اسی شہر میں ہو گیا تھا اور وہ یہیں آفیسرز کالونی میں رہ رہے تھے۔ یہ کالونی شہر کے کنارے آباد ہے۔ یہ جگہ سرسبز و شاداب ہے اور یہاں کی فضا دلکش و دلفریب ہے۔ اس کے پچھواڑے میں بہتی ہوئی ندی اس کے حسن میں اور بھی اضافہ کرتی ہے۔ گل مہر اور املتاس کے پیڑ اس کو موسم بہار میں لال، پیلے پھولوں سے سنوار دیتے ہیں۔ اس وقت یہ کالونی کوئی دوشیزہ معلوم ہوتی ہے۔ اس کالونی میں دس پندرہ کشادہ اور خوب صورت کوارٹر موجود ہیں جن میں ضلعے کے اعلیٰ عہدے دار رہتے ہیں۔ عام آدمی کا گزر اس علاقے میں شاذ و نادر ہی ہوتا ہے۔ شہر کے ہم رتبہ لوگ ہی ادھر کا رخ کرتے ہیں۔ میں بھی وہاں کبھی نہیں گیا تھا۔ جاوید سے متعارف ہو جانے کے بعد ہی مجھے وہاں جانے کا اتفاق حاصل ہوا تھا۔ جب میں پہلی بار کالونی کی طرف گیا تھا تو عجیب سی اضطراری کیفیت سے مجھے گزرنا پڑا تھا۔ جاوید کی شخصیت بڑی پر کشش تھی۔ وہ کم آمیز اور کم سخن لڑکا تھا۔ ٹھہر ٹھہر کر باتیں کرنے کا اس کا انداز بہت ہی نرالا تھا۔ اس کی چمک دمک نے مجھے متاثر کیا تھا۔ لہٰذا اس سے ہوئی اتفاقیہ ملاقات کو میں نے تعلقات میں بدل ڈالنے کی پر زور کوشش کی تھی اور اس میں مجھے کامیابی بھی نصیب ہوئی تھی۔ میں نے اسے اپنے یہاں مدعو کیا تھا اور اُس موقعے پر ایک پر تکلف دعوت کا اہتمام کیا تھا جسے اُس نے پسند بھی کیا تھا اور اپنے نپے تلے انداز میں اس کا اظہار بھی کیا۔ مجھے اُسے اپنے یہاں پا کر بڑی مسرت ہوئی تھی۔ میں نے اُسے اپنی والدہ سے ملایا۔ اپنے بھائی بہنوں سے ملایا۔ اپنی کتابوں کو دکھایا۔ اس روز کے بعد سے میرا اس کا ملنا جلنا مستقل طور پر ہوتا رہا۔ یوں تو وہ میرے یہاں کبھی کبھار آتا لیکن میں تقریباً روزانہ اس کے یہاں جاتا۔ رفتہ رفتہ میں اس کے گھر کے دیگر افراد سے بھی گھل مل گیا تھا۔

میں اس کے چھوٹے بھائی بہنوں کو پڑھا دیتا۔ اس کے گھر کے چھوٹے موٹے کاموں میں بھی ہاتھ بٹا دیتا۔ جاوید کے ساتھ بازار جاتا۔ وہ شاپنگ کرتا اور میں اس کے ساتھ رہتا۔ جاوید گھر میں نہیں ہوتا تو میں انجنیئر صاحب کے پاس بیٹھنے کی کوشش کرتا۔ ان سے گفتگو کر کے خوشی محسوس کرتا۔ انجینئر صاحب اپنے بچوں کو بہت پیار کیا کرتے تھے۔ ان سے دوست جیسا برتاؤ کیا کرتے تھے۔ دن عید اور رات شب برات والی کہاوت انجینئر صاحب کے خاندان کے پر مسرت ماحول ہی پر صادق آتی تھی۔ اف خدا! ایک ہم لوگوں کا گھر۔ آپسی رفاقت اور محبت کا ایسا فقدان کہ ایک ہی چھت کے نیچے اجنبی جیسا رشتہ۔ ٹرین اور بس کے مسافروں میں بھی کچھ لگاؤ پیدا ہو جاتا ہے۔ لیکن نچلے متوسط طبقے کے گھر مالی بحران کی وجہ سے جہنم بنے ہوئے ہوتے ہیں برسوں بیت جانے کے بعد آج سوچتا ہوں کہ آخر کشش والی وہ کون سی ایسی بات تھی جس نے میرے دل میں گھر بنا لیا تھا۔ شاید میں اپنی کمی کو ان کے گھر جا کر پورا کرتا تھا۔ انسان کی شخصیت میں جو کمی ہوتی ہے۔ وہ انسان دوسروں سے مکمل کرنا چاہتا ہے اور اس تکمیل کے احساس سے اُسے سکھ بھی حاصل ہوتا ہے۔ بہر حال میرے اور جاوید میں بہتر تعلقات قائم ہو گئے تھے اور وہ بحسن وخوبی انجام پا رہے تھے۔

اُنھیں دنوں جاوید کی بہن اور بہنوئی آئے۔ بہنوئی بھی کوئی اعلیٰ عہدہ دار تھے۔ وہ مخصوص طبیعت کے آدمی تھے اور لوگوں سے کم ملتے جلتے۔ کبھی کھل کر باتیں نہیں کرتے۔ ان کا زیادہ تر وقت مچھلیوں کے شکار میں گزرتا جسے وہ کالونی کے پچھواڑے میں بہتی ہوئی ندی میں کرتے۔ میں نے ان سے بھی قربت پیدا کرنے کی کوشش کی تھی۔ میری خواہش ہوا کرتی تھی کہ وہ مجھ سے کچھ بولتے۔ میرے ساتھ بازار گھومتے، میرے گھر آتے اور مجھ سے تاریخ، ادب اور کلچر وغیرہ کی باتیں کرتے جو ان دنوں میرا محبوب مشغلہ تھا۔ جاوید کو ایک ہی بھانجا تھا۔ اس کا نام پنکو تھا۔ وہ چار پانچ برسوں کا پیارا سا بچہ بالکل گورا، چٹا، گول مٹول، نٹ کھٹ اور باتونی تھا۔ وہ جاوید سے بہت گھلا ملا ہوا تھا اور جاوید بھی اس پر اپنی جان نثار کیے ہوئے تھا۔ مجھے بھی پنکو بہت زیادہ پسند تھا اور میں اس کو خوب پیار کرنا چاہتا

تھا۔ اکثر میری خواہش ہوا کرتی تھی کہ میں اُسے اپنی سائیکل پر گھماؤں۔ میں گھوڑا بن جاؤں اور اپنی پیٹھ پر بٹھا کر اُسے فرش پر گھوڑ سواری کا مزہ دوں۔ میں ان دنوں جب بھی اس کے یہاں گیا تو اس کے لیے ٹافیاں یا کھلونے وغیرہ لے کر گیا لیکن ایک بات مجھے آج تک سمجھ میں نہیں آئی کہ مجھے پنکو سے جتنی رغبت تھی اس قدر پنکو کو مجھ سے چڑ کیوں تھی؟ کیا میں اُسے دیکھنے میں مسخرہ معلوم ہوتا تھا یا پنکو کی تربیت ہی کچھ اس ڈھنگ سے ہو رہی تھی کہ وہ گھر کے باہر کے لوگوں میں لگاوٹ محسوس نہیں کرتا تھا۔ ایک تو وہ میری لائی ہوئی چیزوں کو کبھی دل سے قبول نہیں کرتا۔ دوسرے کبھی میری خواہش کے مطابق میرے پاس نہیں نکلتا۔ بات چیت میں بھی وہ اکثر آپ سے تم پر چلا آتا تھا۔ اس وقت مجھے گمان ہوتا کہ کہیں وہ اپنے کسی بدصورت ملازم سے بات تو نہیں کر رہا ہے۔ جب میں اُسے کہتا۔ میں تمہارا ماموں ہوں، تو وہ فوراً انکار کر جاتا۔ ''نہیں تم میرے ماموں نہیں ہو۔'' اتنی چاہت کے باوجود، پنکو کے اس رویے سے میرا دل دکھ جاتا۔ اگر میں ماموں ہونے کا اصرار بار بار کرتا تو وہ چڑ کر میرے چہرے کو نوچنے کھسوٹنے لگتا۔ اس وقت میری وحشت دیکھنے کے قابل ہوتی۔

ایک روز میں اور جاوید بازار گھوم رہے تھے۔ جاوید کے ساتھ پنکو بھی تھا۔ جو اس کی انگلی پکڑے اس کے ساتھ چل رہا تھا۔ شہر میں کوئی سرکس آیا ہوا تھا۔ بازار گھومنے کے بعد ہم لوگوں کا ارادہ سرکس جانے کا تھا۔ تھوڑی دیر چلنے کے بعد پنکو کے آرام کے لیے میں نے اسے گود میں اٹھالینا چاہا لیکن وہ تیار نہیں ہوا بلکہ چھوتے ہی بگڑ گیا۔ ''میں تمہاری گود میں نہیں جاؤں گا، میں ماموں جان کے ساتھ ہی چلوں گا۔'' میں نے اس کی ہٹ کو دیکھ کر اپنا ارادہ ملتوی کر دیا۔ میں ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد، ہم لوگ ایک مٹھائی کی دکان کے سامنے سے گزرے۔ وہاں پہنچ کر پنکو رک گیا اور دکان کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگا۔ ''میں مٹھائی لوں گا۔'' جاوید یہ سن کر مٹھائی خریدنے کے لیے دکان کی طرف بڑھنا ہی چاہ رہا تھا کہ میں نے اسے روک دیا اور پنکو کے گالوں پر چٹکی لیتے ہوئے کہا۔ ''میں مٹھائی خرید دوں گا اپنے پنکو کو۔'' یہ کہہ کر میں دکان کی طرف بڑھا اور

مٹھائی خرید کر واپس مڑا اور یہ کہتے ہوئے۔ ''لو بھائی کھاؤ'' پنکو کی طرف بڑھا دیا۔ پنکو نے میری بڑھائی ہوئی مٹھائی کو لینے سے انکار کیا اور ضد کرنے لگا کہ ''نہیں میں تمہاری مٹھائی نہیں لوں گا۔ میں تو اپنے ماموں جان سے مٹھائی لوں گا۔'' میں نے پنکو کو پچکارا۔ لے لو بھائی، میں بھی تو تمہارا ماموں ہی ہوں۔'' پنکو چند لمحوں کے لیے خاموش ہو گیا اور اس نے میری مٹھائی کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ مجھے یہ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی کہ پنکو نے میری پیش کی ہوئی چیز قبول کر لی۔ میں اس خوشی سے لطف اندوز ہونا چاہ رہا تھا کہ اچانک پنکو نے ہاتھوں میں لی ہوئی مٹھائی کو سامنے فٹ پاتھ کی طرف پھینک دیا اور پھر ضد کرنے لگا کہ ''نہیں میں تمہاری مٹھائی نہیں لوں گا، میں تو اپنے ماموں جان ہی سے مٹھائی لوں گا۔''

فٹ پاتھ پر پھینکی گئی مٹھائی کی طرف کتے لپکے۔ میں اس مٹھائی کو دیکھ کر، اپنے شکستہ جذبات کا ماتم کرنا چاہ رہا تھا کہ میری نظر ایک ادھیڑ عمر کے شخص پر پڑی جس کے ساتھ ایک چھوٹا سا بچہ بھی تھا۔ افلاس زدہ ادھیڑ عمر کا شخص، ننگے پیر بچے کو اپنے ساتھ لیے فٹ پاتھ پر سبزیاں خرید رہا تھا۔ دونوں کی پشت میری طرف تھی۔ چہرہ میں نہیں دیکھ پا رہا تھا۔ لیکن مجھے ان دونوں کو پہچاننے میں ذرا بھی دشواری نہیں ہوئی تھی۔ وہ میرے اپنے بہنوئی تھے۔ وہ میرا سگا بھانجا تھا۔

اس بچے کو ٹافیاں، کھلونے اور مٹھائیاں دینا، بازار گھمانا اور سرکس دکھانا تو دور کی بات ٹھہری، میں نے ایک ہی شہر میں رہ کر برسوں سے اس کی صورت بھی نہیں دیکھی تھی۔

آشوب چشم

اس کو جب بھی میں دیکھتا تو میرے ہوش حواس اُڑ جاتے۔ میرے تمام اعضا کام کرنا بند کر دیتے۔ ایسا محسوس ہوتا کہ پورا جسم مفلوج ہو گیا ہے۔ میں بڑی مشکل سے اپنے آپ پر قابو پاتا اور کسی نہ کسی طرح زمین پر کھڑا رہ پاتا۔ وہ اکثر کسی گلی سے نکل کر یا کسی چوراہے پر بازار کی بھیڑ میں سے اچانک سامنے آجاتا اور بہت کچھ گزر چکنے کے بعد بھی سلام کرنے میں وہی پہل کرتا۔ ''السلام علیکم''۔ میں بڑی مشکل سے اُسے جواب دے پاتا ''وعلیکم السلام'' پھر وہ نظروں سے اوجھل ہو جاتا اور کئی دنوں کے لیے غائب ہو جاتا۔ اس وقت مجھے یہ سوچ کر راحت مل جاتی کہ اب اس کا سامنا نہیں ہوگا اور مجھے اُس سے نجات مل جائے گی۔ میں چند روز اس خوش فہمی میں ضرور مگن رہتا، لیکن پھر کسی نہ کسی دن وہ قبل کی طرح سامنے آجاتا اور میں پریشان ہونے لگتا۔ اس بے بسی میں خدا سے دعا مانگتا کہ یا اللہ اس سے میرا سامنا ہی کیوں ہو۔ مجھ میں اس سے آنکھیں چار کرنے کی قوت نہیں ہے۔ میں اس کو دیکھ کر مضطرب و مضمحل ہو جاتا ہوں۔ لیکن پھر وہی ''السلام علیکم''!

ایک روز تو میں اس کو نظر انداز کر کے اس سے تقریباً فرار اختیار کیا ہی چاہتا تھا کہ وہ تیز قدم چل کر سامنے آگیا اور کہنے لگا۔ ''آپ بخیر تو ہیں بھائی صاحب!'' میں نے ٹالتے ہوئے جواب دیا۔ ''ہاں ٹھیک ہوں۔'' اُس نے پھر پوچھا۔ ''یہاں کہاں رہتے ہیں؟'' میں نے اُسے اپنے محلے کا نام بتایا۔ اس کے بعد اس نے میرے بیوی بچوں کے بارے میں جاننا چاہا۔ اس سے مزید گفتگو کے لیے میں ہرگز تیار نہیں تھا۔ مگر وہ تھا کہ بڑی بے تکلفی سے باتوں کے سلسلے کو بڑھاتا جا رہا تھا۔ آخر

میں اس نے یہ بھی کہہ دیا۔ ''بھائی صاحب! میرے لائق کوئی خدمت ہو تو مجھے یاد کرلیں گے۔''
اللہ اللہ اب بھی وہ میری خدمت کے لیے تیار ہے۔ میں اس کی جگہ ہوتا تو سلام کلام کیا، اس کا منھ
نوچ لیتا۔ ہوسکتا تھا کہ غصے میں اس کی گردن دبوچ لیتا۔ لیکن وہ پتہ نہیں کس مٹی کا انسان تھا؟ اس
نے ایک بار پھر متانت اور خلوص کے ساتھ مجھے سلام کیا اور کسی گلی میں گم ہو گیا۔

اس روز میں پہلی بار پسیجا اور سوچنے لگا کہ اس نے مجھ سے اتنی باتیں پوچھیں اور پھر خود ہی خدمت
کے لیے تیار ہوگیا اور میں اس سے یہ بھی نہیں پوچھ سکا کہ تم کس حال میں ہو؟ پھر میں نے ارادہ کیا
کہ اب وہ جب بھی ملے گا تو کسی نہ کسی طرح اپنے جذبات پر قابو رکھ کر اس کا حال ضرور پوچھ
لوں گا۔

اس بات کو چند دن گزرے تھے کہ ایک چوراہے پر اس سے سامنا ہو ہی گیا۔ چوراہے پر کھڑے
کھڑے میں نے اس کی زندگی کے متعلق چند سوالات کر ڈالے۔ میں نے پوچھا۔ ''آج کل تم
کہاں رہتے ہو؟'' اس نے اپنا پتہ بتایا۔ وہ میرے پڑوس کے ہی ایک بالکل پس ماندہ محلے
میں کرایے کے ایک چھوٹے سے مکان میں رہ رہا تھا۔ میں نے پوچھا۔ ''ان دنوں تم کیا کام کرتے
ہو؟''

''فٹ پاتھ پر کراسن تیل بیچتا ہوں۔''

پھر میں نے پوچھا۔ ''تمہاری ماں کیسی ہیں؟''

اس نے جواب دیا، ''بیمار رہتی ہیں اور آپ لوگوں کو اکثر یاد کرتی ہیں۔'' کیوں؟ ہم لوگوں کو کیوں
یاد کرتی ہیں؟ کس طرح یاد کرتی ہیں؟ ہم لوگوں نے انھیں یاد رکھنے کے لیے باقی ہی کیا چھوڑا؟
میں ان سوالات کی چبھن سے کچھ بے یقین سا ہوا۔ میرے ذہن میں آیا کہ اس سے دریافت

کروں کہ تم گاؤں جاتے ہو یا نہیں۔ لیکن مجھے گمان ہوا کہ اس سوال کی معنویت کہیں اس کو آزردہ نہ کردے۔ میں نے کسی طرح اپنی بات چیت مکمل کی اور الوداعی سلام کلام کے بعد فوراً اپنے راستے پر آگے بڑھ گیا۔

اس روز کے بعد بہت دنوں تک میری اس سے ملاقات نہ ہو سکی ۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ فٹ پاتھ پر بغیر لائسنس کے کراسن تیل بیچنے کے جرم میں اُسے چند دنوں کے لیے جیل جانا پڑ گیا تھا اور جیل سے باہر آنے کے بعد وہ اس شہر کو چھوڑ کر کسی دوسری جگہ چلا گیا۔ لیکن اس کی ماں کے متعلق کوئی یقینی خبر نہ مل سکی ۔ کسی نے کہا کہ وہ مر گئی ۔ کسی نے کہا کہ نہیں! ابھی زندہ ہے اور وہ بھی اپنے بیٹے کے ساتھ کہیں چلی گئی ہے۔ اس کی گم نامی اور بے خبری نے مجھے کشمکش میں ڈال دیا۔ کبھی اس کی بے چارگی اور بے بسی پر ملال ہوتا۔ کبھی میں سوچتا کہ چلو، جس طرح کی زندگی وہ یہاں گزار رہا تھا اس طرح کی زندگی تو وہ کہیں بھی گزار لے گا۔ لیکن اس کے اس شہر کو چھوڑ کر چلے جانے سے مجھے یہ راحت ضرور حاصل ہوگی کہ اب میرا اس سے سامنا نہ ہو سکے گا اور میں اضطراب و ہیجان سے محفوظ رہوں گا اور انشاء اللہ بغیر کسی ڈپریشن کے اپنے کاموں کو انجام دوں گا۔ مگر کبھی کبھی اپنے اس رویے سے میں حیرت میں بھی پڑ جاتا کہ آخر میں اس قدر پست خیال کیوں ہو گیا ہوں؟ لیکن میرے دل و دماغ اس سوال کا کوئی جواب نہ دے پاتے ۔ شاید میرے ذہن کا فریب یا میری تن آسانی مجھے مغلوب کر دیتی اور میں اس سے نجات حاصل کر سکنے کے لیے خدا کا شکر ادا کرتا۔

اس طرح کچھ اور وقت گزرا۔ اس سے میری ملاقات تو اب ہوتی نہیں تھی ۔ شب و روز اطمینان سے گزر رہے تھے ۔ اسی درمیان موسم گرما کی تعطیل ہوئی ۔ مجھے گاؤں کی زندگی یاد آ گئی ۔ آم کا لطف، کھلی چھت، گھر کے سامنے میدان اور باغات میں شاداب اور ثمر دار درختوں کی چھاؤں اور عزیز و اقارب کے ساتھ رفاقت کے خوب صورت لمحے ۔ ان باتوں کی کشش اچانک مجھ میں

جاگ اُٹھی اور اس نے مجھے گاؤں جانے کے لیے آمادہ کرلیا۔ جو میرا مولد اور قدیمی مسکن تھا۔ پھر ایک دن بیوی بچوں کے ساتھ وہاں پہنچ بھی گیا اور وہاں مجھے وہ تمام چیزیں میسر ہوئیں جن کا ذکر میں نے اوپر کیا ہے۔ ہمارا گھر اب اور بھی کشادہ اور آرام دہ ہوگیا تھا۔ بالکل جدید طرز پر ابھی حال میں اس کی توسیع ہوئی تھی۔ اس موقعے پر خاندان کے دیگر افراد سے بھی ملاقاتیں ہوئیں جو میری طرح گھر آئے تھے۔ بچپن کے کئی ساتھی بھی مل گئے۔ سب موقعے کی مناسبت سے گاؤں آئے ہوئے تھے کہ ہمارا گاؤں انواع واقسام کے آموں کے لیے مشہور ہے اور تمام بکھرے ہوئے لوگوں کو سال میں کم از کم ایک بار اس موسم میں گھر آنے کی ترغیب دیتا ہے۔

وہاں صبح کس طرح ہوتی۔ دن کس طرح گزرتا، اور پھر شام کیوں کر آجاتی۔ مجھے پتہ ہی نہ چلتا۔ دوپہر کے وقت گداز بستر پر آرام کرتا، شام کو قصبے کے نزدیک کے بازار کی سیر کرتا، رات کو چاندنی میں نہاتا اور پھر یہ کہ ایسے جنت نشان مقام پر اس آدمی سے مجھے فرصت حاصل تھی جو شہر میں میرے لیے سوہان روح بن گیا تھا۔ میں اب اس کو تقریباً بھول چکا تھا اور اس کا خیال دل ودماغ سے نکل جانے کی وجہ سے میرا اضطراب بالکل ختم ہوگیا تھا۔ اب مجھے اس بات کا ذرا بھی خدشہ نہ تھا کہ وہ کسی گلی، کسی موڑ، کسی چوراہے پر اچانک بالکل میرے سامنے آکھڑا ہوگا۔

لیکن ہونی تو ہو کر رہتی ہے۔ اتنے دنوں بعد مجھے وہ بالکل بے وقت مل ہی گیا۔ شب کا آخری حصہ تھا۔ بارش ہو رہی تھی اور موسم میں خنکی تھی۔ میں گہری نیند سویا ہوا تھا کہ میں نے محسوس کیا کہ کوئی دبے پاؤں میرے کمرے میں داخل ہوا ہے اور میری پائینتی بیٹھ گیا ہے۔ میں نے دیکھا۔ اس کی آنکھیں چاروں طرف گردش کر رہی ہیں۔ شاید وہ کچھ ڈھونڈ رہا ہے۔ پھر وہ رونے لگا ہے۔ زاروقطار رونے لگا ہے۔ اس کی ہچکیاں بندھ گئی ہیں اور اس کی سسکیوں کی آواز کمرے میں پھیل گئی ہے۔ میں نے اس کی دل جوئی کرنی چاہی ہے۔ اس کے آنسوؤں کو پونچھنا چاہا ہے کہ میری

نیند ٹوٹ گئی۔

نیند کھل جانے کے بعد بھی وہ اسی طرح روتا ہوا میری آنکھوں کے سامنے موجود رہا۔ حد یہ ہے کہ آج بھی ابھی بھی، وہ اسی حالت میں میری آنکھوں میں موجود ہے۔ لیکن اپنی آنکھوں میں بسا لینے کے علاوہ میں اس کے ساتھ اور کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ میری آنکھوں میں چبھن سی پیدا ہو گئی ہے لیکن اس کا علاج ڈاکٹر سے پوچھ لوں گا۔

بدلتے موسم کا رنگ

رشو کو میرے گھر آئے آج تیسرا دن ہو گیا تھا۔ یوں تو وہ دن بھر میں دو تین بار آیا کرتا، لیکن ادھر کیا بات ہوگئی تھی کہ وہ پہلی بار اتنے دنوں تک غیر حاضر رہ گیا تھا۔ یہ بھی نہیں کہ وہ بیمار تھا یا کہیں باہر گیا ہوا تھا۔ بلکہ وہ ٹھیک ٹھاک تھا اور تھا بھی یہیں۔ سویرے بھی میں نے اس کی آواز سنی تھی۔ وہ اپنے برآمدے میں سنڈے منڈے کے ہجے یاد کر رہا تھا۔ اس کی آواز مجھے صاف سنائی پڑ رہی تھی۔ ہاں وہ دکھائی نہیں پڑا تھا۔ اس لیے کہ برآمدے میں پردہ پڑا ہوا تھا۔ پھر رشو کو میرے گھر آئے تین دن کیوں ہو گئے؟ اس نے پہلی بار میرے یہاں آنے میں ناغہ کیا تھا۔ پہلے جب وہ کہیں باہر جاتا تو آنے کے بعد سب سے پہلے میرے یہاں آتا اور آتے ہی کہتا۔ ''انکل! میں آگیا۔'' اگر وہ بیمار پڑ جاتا تو مجھے خود بلوا لیتا۔ اس حالت میں، میں صبح و شام چند منٹوں کے لیے اس کے پاس ضرور جاتا، لیکن یہ پہلا موقع تھا کہ رشو میرے یہاں نہیں آ رہا تھا۔ پتہ نہیں کیا بات ہوئی؟ اس نے کیوں آنا چھوڑ دیا؟ میں انھیں باتوں میں محو کالج چلا گیا اور وہاں بھی رشو کے متعلق ہی سوچتا رہا۔

رشو میرے پڑوسی کا بچہ ہے۔ ہم لوگ جس مکان میں رہتے ہیں اس میں پانچ حصے ہیں۔ پانچوں حصے میں مختلف خاندان کرایے پر رہتے ہیں۔ میرے حصے کے ٹھیک سامنے والے حصے میں رمیش جی رہتے ہیں۔ وہ یہاں ایک دفتر میں ملازم ہیں۔ ان کے تین بچوں میں رشو سب سے بڑا ہے۔ وہ ابھی تیسرے درجے میں پڑھتا ہے۔ رمیش جی سے مجھے کوئی خاص تعلق نہیں ہے۔ بس تعارف بھر اور سامنے ہو جانے پر علیک سلیک ہو جایا کرتی ہے۔ ہاں رشو کی ماں اور میری بیوی میں گہری دوستی ہے۔ دوستی تو اس مکان کی تمام عورتوں میں ہے۔ اصل میں اس مکان کے سبھی مرد نوکری پیشہ

ہیں۔ جو دن بھر اپنے دفتروں میں رہتے ہیں۔ مردوں کی غیر حاضری میں یہ عورتیں ایک دوسرے سے بات چیت کر کے، وقت گزار لیتی ہیں گلے شکوے بھی اکثر ہوتے رہتے ہیں۔ شاید کچھ شکوے، کچھ شکایت جینے کے مزے میں شامل ہیں۔ عورتوں کے تعلقات میں عام طور پر اعتدال کی بھی کمی ہوتی ہے۔ کبھی خوب دوستی رہی اور کبھی معمولی باتوں، یہاں تک کہ بچوں کی باتوں پر بھی لڑائی ہوگئی اور بات چیت بند ہوگئی۔ لیکن اس بات چیت کا بند ہونا مردوں کی بات چیت کے بند ہونے سے مختلف ہوتا ہے۔ مردوں میں جب بات چیت بند ہوتی ہے تو پھر دل کے صاف ہونے اور تعلقات کے بحال ہونے میں ایک وقت لگ جاتا ہے۔ لیکن عورتوں کا یہ خصوصی امتیاز ہے کہ ان کی بات چیت جس طرح کے معمولی بہانوں سے بند ہوتی ہے اسی طرح کے بہانوں سے شروع بھی ہو جاتی ہے۔ رشو کی ماں اور میری بیوی کی دوستی کے بعد ہی رشو کا ہمارے یہاں آنا جانا شروع ہوا۔ رشو بہت ہی پیارا بچہ ہے۔ اس کی بولی بہت ہی پیاری ہے۔ اس میں بچوں والی معصوم تتلاہٹ بھی شامل ہے۔ اسے اسکول میں یاد کرائی گئی انگریزی اور ہندی کے ملے جلے الفاظ والی ڈھیر ساری نظمیں یاد ہیں۔ جنھیں وہ مجھے اکثر سناتا رہتا ہے۔

ایک بار اس نے مجھے ایسی ہی بہت ساری نظموں کو سنایا تھا۔ مجھے وہ نظمیں بہت پسند آئی تھیں۔ ایک دو بہت ہی اچھی نظموں کو سن کر میں نے اسے ٹافیاں دینے کا وعدہ بھی کیا تھا۔ اس پر وہ مچل گیا تھا اور اس نے کہا تھا۔ ''انکل! تب تو اور بھی نظمیں سناؤں گا۔'' میں نے کہا تھا۔ ''ضرور سناؤ اچھی نظمیں ہوں گی تو میں اور بھی ٹافیاں دوں گا۔'' یہ سن کر اس کی خوشی کی انتہا نہیں رہی تھی۔ اس نے اور بھی کئی نظمیں سنا ڈالیں۔ ویسی ہی نظمیں جیسی آج کل اسکولوں میں بچوں کو سکھائی جاتی ہیں۔ جن میں تفریح بھی ہوتی ہے اور تھوڑا سبق بھی۔ یہ نظمیں تھیں جانوروں سے متعلق۔ چڑیوں سے متعلق۔ زمین اور آسمان سے متعلق۔ بھائی بہن اور والدین سے متعلق۔ جب اس کی نظموں کا اسٹاک ختم ہوگیا تو میں نے اس سے پوچھ ڈالا۔ ''رشو! تم کو بارش سے متعلق کوئی نظم یاد ہے؟'' اس نے ذرا سوچا اور پھر کہا: ''نہیں انکل! مجھے بارش پر ایسی کوئی نظم یاد نہیں ہے۔'' میں نے کہا'' میں

سکھادوں۔" یہ سن کر وہ میرے اور بھی نزدیک آگیا اور کہا: "ہاں انکل ضرور ایسی کوئی نظم سکھادیں۔" میں نے ذہن پر زور ڈالا۔ میری یادداشت میں ایسی ایک نظم موجود تھی۔ میں جب چھوٹا تھا تو اس وقت ہمارے ماموں جان شہر میں انجینئر نگ کالج کے طالب علم تھے تو ہم لوگوں کے لیے کھلونے اور اسی طرح کی نظموں اور کہانیوں کی کتابیں لایا کرتے تھے۔ لیکن ہم لوگ گاؤں میں رہ کر پڑھا کرتے تھے جہاں ماسٹروں کی چھڑیاں ہماری آنکھوں کے سامنے چمکا کرتی تھیں۔ وہاں ایسی نظموں کو سیکھنے اور دہرانے کا موقع کہاں تھا؟ اور ہمارے ماسٹر صاحبان، بے چارے تھے بھی کیسے؟ ناکامیوں، محرومیوں اور مایوسیوں کے مرقع۔ جب کہیں کوئی کام نہیں ملا تو کسی دروازے پر دو وقتوں کے کھانے کے عوض، بچوں کو پڑھانے کا کام اختیار کرلیا کرتے تھے۔ ماموں جان کی سکھائی ہوئی نظموں کو دہرانے کا ماحول اور موقع کبھی نہیں ملا۔ اس لیے ان میں سے زیادہ تر نظمیں رفتہ رفتہ ذہن سے اُتر گئیں۔ بس ایک نظم اس روز یادداشت کے پردے میں ابھری اور وہ تھی بارش کے موضوع پر۔ میں نے ذہن میں نظموں کے بندوں کو کریدتے ہوئے رشو کی طرف دیکھا۔ وہ پر اشتیاق نگاہوں سے میری طرف دیکھ رہا تھا کہ میں اسے کون سی نظم سکھاتا ہوں۔ میں نے اُسے بتایا۔ "اٹ از رینگ جھما جھم، لیگ مائی پھسلا گر گئے ہم۔" اس نظم میں چند اور بھی بند تھے جو مجھے اس وقت یاد نہیں رہے۔ بہر حال رشو کو یہ نظم بہت پسند آئی اور اس نے اسے یاد بھی کرلیا اور اُسے میرے سامنے کئی بار دہرایا بھی تھا۔ میری فرصت کا اکثر وقت رشو کے ساتھ گزرتا۔ وہ مجھ سے انگریزی سیکھتا اور کبھی کبھی مختلف موضوعات پر اتنے سوالات ایک ہی بار کر ڈالتا کہ میری پریشانی بڑھ جاتی۔ لیکن میرے دل میں اس کی چاہت اس قدر تھی کہ میں اپنی اوب ظاہر کیے بغیر اس کے سوالوں کا جواب دیتا جاتا۔

وقت اسی طرح گزرتا رہا اور کئی ماہ بیت گئے۔ گذشتہ اکتوبر ہی سے ملک کی فضا انتہائی مکدر رہی۔ ہمارے شہر کے آسمان میں بھی کالے بادل منڈلانے لگے تھے۔ درجنوں لوگوں کی جانیں گئیں۔ کئی گھر جلے۔ کئی دکانیں لوٹی گئیں۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہوئی کہ اس مکدر فضا نے دلوں کے چنار کو بھی جلا ڈالا۔ لوگوں کا ایک دوسرے پر اعتماد ختم ہوگیا۔ آپس کی دوریاں بڑھ گئیں۔ ایک

دوسرے سے ملنا جلنا کم ہوگیا۔ چہرے کی مسکراہٹیں شک وشبہ کی آگ میں جل کر خاکستر ہوگئیں۔ ہمارے شہر میں تو ایک وقت ایسا بھی آیا کہ غیر محفوظ علاقوں کے لوگ محفوظ جگہوں میں جانے لگے۔ ہم لوگ جس عمارت میں مقیم تھے۔ وہ بھی خالی ہوگئی۔ اس کے بھی تمام مکین ان پراگندہ حالات میں محفوظ ٹھکانوں کی طرف چلے گئے اور کئی مہینوں کے بعد جب حالات نارمل ہوئے تو واپس آئے۔ ان الم ناک حالات میں بھی جب لوگ مضطرب اور منتشر تھے مجھے رشو کی یاد اکثر آجاتی اور جب سکون کے کچھ لمحے ملتے تو اس وقت اس سے ملنے کے لیے دل مچل جاتا۔ ہنگاموں کے دوران جب بھی رمیش بابو سے ملاقات ہوتی تو میں ان سے رشو کے متعلق پوچھ لیتا۔ رشو کی خیریت جان کر سکون کا احساس ہوتا اور وہی احساس اس وقت مسرت وانبساط کا ذریعہ بنتا۔

اس روز میرا دل ذرا بھی کالج میں نہیں لگا۔ وہاں بھی بیٹھے بیٹھے یہی سوچتا رہا کہ آخر رشو کا میرے یہاں آنا بند کیوں ہوگیا؟ میں نے سوچا کہ گھر واپس ہو کر شام کو رشو کے پتا سے دریافت کروں کہ آخر رشو دو تین دنوں سے میرے یہاں آیا کیوں نہیں؟ یہی ارادہ کر کے کالج سے گھر کی طرف چلا۔ جب گھر پہنچا اور سیڑھیاں چڑھ کر برآمدے میں داخل ہوا ہی تھا کہ جو کچھ میں نے دیکھا اور سنا اس نے میرے وجود کو ہلا ڈالا۔ رشو میری آہٹ سن کر میرے یہاں آنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن اس کی ماں اسے روک رہی تھی اور کہہ رہی تھی: ''بیٹے! انکل کے یہاں مت جاؤ۔ زمانہ بہت خراب ہے......؟ رشو کی ماں نے کچھ اور بھی کہا لیکن ان الفاظ کو سننے کی سکت مجھ میں باقی نہیں رہ گئی تھی۔ لہٰذا لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے میں آگے بڑھ گیا۔ خزاں کے پھول میری راہوں میں بکھرے ہوئے تھے اور آتش فشاں کے لاووں کی طرح دہک رہے تھے۔

لیکن پھر میں نے سوچا کہ ان حالات میں کیا رشو کی ماں تنہا ایسی عورت ہے یا پھر کہیں کسی ندیم کی ماں بھی ہے جو ندیم کو کسی ایسے ہی انکل سے ملنے سے روک رہی ہے؟ میں دیر تک اندھیرے کے بطن سے پیدا نفرت بھرے ان سوالوں میں الجھا رہ گیا تھا۔

بہتی رہے گنگا

''پاپا! گنگا سوکھ رہی ہے۔'' یہ آواز اس کے کانوں میں گونجی۔ اس نے بازو میں بیٹھے اپنے نوجوان بیٹے کی طرف دیکھا اور جواب دیا۔ ''ہاں بیٹے، گنگا سوکھ رہی ہے۔'' اُس نے ذرا رک کر پھر کہا۔ لیکن برسات میں پھر سیراب ہو جائے گی۔'' اس کا بیٹا خاموش ہو گیا اور دونوں بوا گھاٹ کی سیڑھیوں پر بیٹھے گنگا کی طرف دیکھنے لگے۔

بازار کے ہنگاموں کو چھوڑ کر قلعے کی سڑکوں اور گنگا کے کناروں پر گھومنا اس کا بچپن ہی سے ایک محبوب مشغلہ تھا۔ اسے یاد آیا کہ تب وہ اپنے بیٹے سے کچھ چھوٹا ہی تھا جب اس کے والد یہیں ایک دفتر میں ملازم تھے۔ ماں اور بھائی بہن بھی یہیں رہا کرتے تھے۔ بچپن سے لے کر اب تک کی عمر کا زیادہ تر حصہ اس نے اسی شہر میں گزارا تھا۔ یہیں اس نے تعلیم پائی تھی۔ یہیں اس کے تین بھائی پیدا ہوئے تھے۔ یہیں اس کی والدہ کا انتقال ہوا تھا۔ یہیں اس نے ملازمت پائی تھی اور یہیں اس نے سماجی زندگی کے برگ وثمر دیکھے تھے۔ اُسے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ گزرے دنوں کے زیادہ تر حصے اسی شہر کے کینوس پر مختلف خاکوں اور رنگوں میں موجود تھے۔ اس نے شام کا وقت ہمیشہ قلعے کے اندر ہی گزارا تھا۔ گنگا کے کنارے گھومتے ہوئے وہ گھنٹوں یہاں بیٹھا تھا۔ گنگا کی اچھلتی کودتی موجوں اور دور اس پار شفق کی سرخی سے لطف اندوز ہوا کرتا تھا۔ زندگی کی تلخیوں اور کرب ناکیوں کو وہ اُنھیں موجوں میں تحلیل کر دیتا اور پھر بہت سکون محسوس کرتا۔ لیکن ادھر کچھ دنوں سے اُسے گنگا کے کنارے آتے ہوئے ایک انجانے خوف کا احساس ہوتا تھا۔ وہ آتا بہت شوق سے تھا لیکن تھوڑی ہی دیر رہ کر اس کا دل اُچاٹ ہو جاتا تھا۔ اُسے ایسا لگتا کہ اب وہ دیر تک یہاں بیٹھ نہیں

سکے گا۔ کبھی کبھی تو وہ کھڑے کھڑے ہی واپس ہو جاتا۔ برسوں کی سیراب گنگا اب سوکھ رہی تھی۔ یوں ابھی اس نے اپنے بیٹے کو یہ کہہ کر چپ کر دیا تھا کہ برسات میں گنگا پھر سیراب ہو جائے گی۔ لیکن حقیقت یہ تھی کہ گنگا نے اپنا رخ موڑ لیا تھا اور اب وہ روز بروز شہر سے دور ہوتی جا رہی تھی۔ برسات ختم ہوتے ہی مہینہ بھی نہیں گزرتا کہ گنگا سوکھنے لگتی۔ ابھی گرمی شباب پر تھی۔ سورج نیچے اُتر آیا تھا۔ اس کی آگ چاروں طرف برس رہی تھی۔ گنگا کا چوڑا پاٹ کئی چھوٹے چھوٹے پاٹوں میں تبدیل ہو گیا تھا اور بیچ ندی میں کئی جگہوں پر ریت کے ٹیلے اٹھ رہے تھے۔ سوکھتی اور ریت اُڑاتی ہوئی گنگا اب کمزور اور بے بس نظر آتی اور وہ اُسے دیکھ کر اُداس ہو جاتا۔

اس نے بوا گھاٹ کی سیڑھیوں کو دیکھا۔ دوسرے لوگ بھی بہت شوق سے آ رہے تھے۔ لیکن آتے ہی ان کی پر اشتیاق نگاہیں بھی مایوس ہو جایا کرتی تھیں۔ وہ حوصلہ منداور مسرور آتے مگر تھوڑی ہی دیر میں افسردہ ہو کر چلے جاتے تھے۔ گنگا سوکھ رہی ہے۔ گنگا کی دھار کبھی اتنی نہیں مری تھی۔ پاٹ اس قدر چھوٹے کبھی نہیں ہوئے تھے۔ وہ سیڑھیوں پر بیٹھا آتے جاتے لوگوں کے ان فقروں کو سن کر مغموم ہو جایا کرتا تھا۔ اس کا دل چاہتا کہ وہ ان کی اداسیوں کو بڑھ کر دور کر دے اور ان لوگوں کو تقویت دے کہ گنگا کبھی نہیں سوکھے گی۔ یہ یوں ہی بہتی رہے گی۔ وہ اپنے اور دوسروں کے دلوں میں بھی یقین و اعتماد کے چراغوں کو جلائے رکھنا چاہتا تھا۔

تاریخ کے اوراق تصورات کے ہاتھوں الٹنے لگے۔ گنگا بھی تو ایک تاریخ ہے۔ ہزاروں سالہ پرانی تاریخ، روایت اور ثقافت سے وابستہ تاریخ۔ ہندوستان میں آریاؤں کی آمد۔ ان کا پہلے پہل گنگا تک پہنچنا اور مسرور ہو جانا۔ کتنی فطری مسرت ہوئی ہوگی ان کو اس شاہانہ ندی کو دیکھ کر۔ غالباً اسی حقیقت کو شاعر مشرق نے اپنی نظم میں یوں پیش کیا تھا۔ اے آب رود گنگا وہ دن ہیں یاد تجھ کو اترا ترے کنارے جب کارواں ہمارا۔ چندر گپت موریہ کے عہد میں یونانیوں کے حملے کو گنگا کے

کنارے ہی روکا گیا تھا۔ گنگا کے کنارے بہت سارے شہر اور گاؤں آباد ہوئے اور اپنی مصنوعات ،تاریخ ، ثقافت اور فنون کے لیے مشہور ہوئے ۔ اشوک کا پایہ تخت پاٹلی پتر، مصنوعات کے لیے مشہور اپنے زمانے کا عظیم الشان شہر قنوج ،سنگم کے لیے مشہور شہر الہ آباد اور یہ خوب صورت شہر مونگیر۔ مونگیر میں میر قاسم کا قلعہ ، جہاں برطانوی سامراج کے آگے بڑھتے ہوئے قدموں کو روکنے کی شروعاتی کوشش کی گئی تھی ۔ گنگا ندی کے کنارے آباد ہزاروں گاؤں اور قصبے، ان کے محنت کش کسان اور مزدور ان کی اپنی دھرتی ، بیجوں کا ڈالنا، لہلہاتی فصلیں اور ان کے سنہرے خوشے، زندگی اور اس کی اُمنگیں.........خیالات کی دنیا میں وہ بہت دیر تک کھویا رہا۔

گنگا کی موجوں میں پیدا ہونے والے گیتوں کے میٹھے میٹھے بول اس کے کانوں میں رس گھول رہے تھے کہ بیٹے نے اُسے پھر مخاطب کیا۔ ''پاپا'' گنگا بالکل سوکھ کیوں نہیں جاتی ہے؟ ایسا ہونے سے اس پر سڑک بن جائے گی اور کمیونی کیشن میں سہولت ہوگی۔ بیٹے کی یہ باتیں سن کر وہ حیرت میں پڑ گیا۔ وہ اُسے کوئی مناسب جواب دینا ہی چاہتا تھا کہ بیٹے نے اُسے مزید الجھا دیا۔ اُس نے نیچے سیڑھیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''ممی یہیں ڈوبی تھیں نا، پاپا!'' بیٹے کی یہ بات سن کر وہ مضطرب ہو گیا۔ اس کے وجود کے سارے تار جھنجھنا اُٹھے ۔ سامنے بہتی ہوئی گنگا کا وہ بھیانک روپ اس کی آنکھوں کے سامنے آگیا۔ وہ اٹھارہ انیس برس قبل کی زندگی میں لوٹ گیا۔

وہ ان دنوں یونی ورسٹی کا طالب علم تھا اور چند دنوں کے لیے شہر آیا ہوا تھا۔ کشٹہرنی گھاٹ میں اُس نے ایک انتہائی حسین لڑکی کو دیکھا تھا۔ دوسرے ہی دن وہ اس کے گھر کا پتہ معلوم کرنے کے لیے شہر کی گلی گلی گھوما تھا۔ اس نے پتہ بھی لگا لیا تھا۔ وہ شہر ہی کے ایک محلے میں رہتی تھی۔ اس نے اس کے یہاں اپنا رشتہ بھجوایا تھا۔ اس وقت وہ خود بھی ایک ہونہار طالب علم تھا اور اسی سال گریجویشن کے امتحان میں یونی ورسٹی میں اول آیا تھا۔ کلپنا کے والد اس کے رشتے کے لیے تیار ہو گئے تھے۔

اُسے یاد آیا: اس نے کلپنا کو بہت پیار کیا تھا۔ زندگی اور محبت کے سارے جام اس پر لنڈھائے تھے۔ کلپنا کے ساتھ اس نے ان تمام جگہوں کی سیر کی تھی۔ جہاں وہ کبھی اکیلے ہی جایا کرتا تھا۔ پھر اُسے راجو کی پیدائش کا دن یاد آیا۔ راجو کے جنم لیتے ہی اس نے کلپنا کے ساتھ خود کو کس قدر مضبوط بندھنوں میں محسوس کیا تھا۔ راجو کو گود میں لے کر پیار سے اُسے ہوا میں اچھال کر، اس نے بہت سارے خواب دیکھے تھے۔ وہ اب بھی خواب دیکھتا ہے۔ وہ فطرتاً تخیل پسند ہے لیکن اب ویسے خواب کہاں؟ ایسا لگتا ہے کہ وہ سب زندگی کے جھوٹے باب تھے۔ یہ سوچ کر اُسے بہت دکھ ہوا۔ اس وقت اس کے تصورات کے پردے میں سیلاب زدہ گنگا کی ایک بھیانک موج شور مچاتی ہوئی گزر گئی۔ اس کے لاشعور میں کسی کی چیخ بھی گونجی۔ وہ چونک پڑا۔ اُسے ایسا محسوس ہوا کہ سب کچھ ابھی ابھی گزرا ہے۔ بے خیالی میں اس کے ہاتھ آگے کی طرف بڑھ گئے .... لیکن یہ تو سترہ اٹھارہ برس قبل کی بات تھی۔ کلپنا گنگا نہانے آئی تھی۔ برسات کا موسم تھا۔ وہ سیڑھیوں پر اتر کر نہا رہی تھی کہ اس کے پاؤں پھسل گئے تھے اور وہ یہیں ڈوب گئی تھی۔

اس نے بڑی مشکل سے ذہن و دل کے اضطراب پر قابو پایا اور تیکھی نگاہوں سے سامنے کی طرف دیکھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اس کی زندگی کی طرح گنگا بھی کانٹوں کا پیرہن پہنے ہوئے ہے۔ یہ خیال فطری طور پر اس کے ذہن میں پیدا ہوا۔ اور وہ اس کے تیز نوکیلے کانٹوں کی چبھن محسوس کر رہا تھا کہ اس کے بیٹے راجو نے پھر اپنا وہی سوال دہرایا ''پاپا''! آپ کا کیا خیال ہے؟ کیا یہ مناسب نہیں ہوگا کہ گنگا بالکل سوکھ جائے تاکہ اس پر سڑک بنا دی جائے جس سے لوگوں کو آنے جانے میں آسانی ہو۔ گرمی اور برسات کے دنوں میں گنگا کا سفر کتنا مشکل ہو جاتا ہے۔'' راجو اپنا سوال مکمل کر کے خاموش ہو گیا اور باپ کی طرف دیکھنے لگا۔ بیٹے کی بات سن کر اسے ایک بار پھر تکلیف کا احساس ہوا۔ وہ تڑپ اٹھا۔ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اس بار ضرور اپنے

بیٹے کی باتوں کا فیصلہ کن جواب دے گا۔ وہ اب ہرگز خاموش نہیں رہ سکتا۔ لہٰذا اس نے اپنی بھیگی ہوئی آنکھوں کو پونچھا۔ اپنا گلا صاف کیا۔ وہ سیڑھیوں پر اور بھی نیچے اتر آیا۔ پاس ہی گنگا بہہ رہی تھی۔ اس نے پانی کی لہروں کو چھوا اور اونچی آواز میں بیٹے سے مخاطب ہوا۔ ''بیٹے سفر کی آسانی ضرور ہوگی۔ لیکن یہ گنگا کے سوکھ جانے کی قیمت پر نہیں۔ کیا ہی بہتر ہو کہ گنگا بھی بہے اور اس پر سڑک اور پل بھی بنیں۔'' وہ چند لمحے خاموش رہا۔ اس کے بعد اس نے اپنے نوجوان بیٹے کو بھرپور نگاہوں سے دیکھا اور پھر کہا۔ ''بیٹے! بے شک میرا غم بہت گراں بار ہے لیکن بہر حال یہ میرا ذاتی غم ہے اور گنگا اس ملک کی زندگی ہے۔ اس نے ہمیں بہت کچھ دیا ہے۔ یہ یہاں کی تہذیبی شناخت بھی ہے اور لاتعداد لوگوں کی خوشیوں کی امین بھی۔ اس لیے بیٹے! اسے بہتے رہنے دو۔''

بازیافت

وہ کچھ دنوں قبل تک ایک مشہور و معروف سیاسی کارکن تھا۔ بہت سارے لوگ اُسے معاشرے کا ایک فعال اور افادی کردار تسلیم کرتے تھے۔ پھر ایسے حالات رونما ہوئے کہ رفتہ رفتہ لوگ اُسے فراموش کرنے لگے۔ اس کی زندگی میں درآئی یہ اچانک تبدیلی اُسے بڑی عجیب لگتی تھی۔ اُسے اس بات کا احساس ہوتا تھا کہ لوگ اُسے بھولنے لگے ہیں۔ لوگوں کے اس بدلتے ہوئے تیور سے کبھی کبھی اُس پر خوف کا احساس طاری ہو جاتا۔ اُسے گھبراہٹ محسوس ہوتی کہ یہ سب کیا ہوتا جا رہا ہے۔ جب وہ خالی ذہن رہتا تو طرح طرح کے خیالات اور بھیانک ہیولے اس کی آنکھوں میں آجاتے۔ اُسے خیال آیا کہ اس روز راستے میں کسی نے اس سے مخاطب ہونے کی کوشش نہیں کی جبکہ قبل چہار جانب سے لوگ اسے سلام کیا کرتے تھے۔ اس صورت حال سے متردد ہو کر اس نے ایک روز بیوی سے پوچھا۔ ''بتاؤ کیا مجھ میں کچھ تبدیلی آگئی ہے؟'' بیوی نے کوئی جواب نہیں دیا تو وہ خود ہی چند ثانیے بعد اپنے ہاتھ پیر دیکھنے لگا۔ اس نے آئینے میں اپنا چہرہ بھی دیکھا۔ لیکن ظاہری طور پر کچھ نہیں بدلا تھا اس کا۔ سب چیزیں ثابت و سالم تھیں۔ پھر ایسا کیوں ہو رہا تھا۔ کبھی کے اس کے انتہائی معروضی ذہن نے اس صورت حال کے اسباب کو ڈھونڈنا چاہا۔ اُسے یاد آیا کہ اس کے حالات اچانک ناموافق ہو گئے تھے۔ معاشی الجھنوں اور گھریلو ذمہ داریوں کی گراں باری نے رفتہ رفتہ اس کی تمام پیش رفتوں میں بیڑیاں لگادی تھیں۔ زندگی کی تلخیوں نے اس کے جمالیاتی احساس کی شیرینی کو کم کر دیا تھا جس کی وجہ سے اس کی روح کی تازگی ختم ہو گئی تھی اور اس میں احساس خوشی کو اجاگر کرنے کی قوت باقی نہ رہی تھی۔ لہٰذا اب وہ سماجی مسائل کو حل کرنے میں

وقت نہیں دے پاتا تھا۔ لوگوں سے ملنے کا معمول بھی کم ہوتا گیا تھا۔ لیکن اس کی بدلتی حالت پر کسی نے توجہ نہیں کی۔ کسی نے یہ نہیں سوچا کہ معاشرے کو وقت دینے والا یہ شخص لوگوں کے دکھ سکھ میں ہمہ ساعت متحرک رہنے والا یہ آدمی اور عوامی تحریکوں میں سانسیں لینے والا انسان اس قدر کیوں بدل گیا ہے۔ اس کی زندگی میں اس طرح کی تبدیلیاں کیوں رونما ہوگئی ہیں۔ کسی نے اس کے شانے پر شفقت اور خلوص کے ہاتھ نہیں رکھے۔ کسی نے اس کے درد کو جاننے کی سعی نہ کی بلکہ اس کے اپنے غیر ہوگئے اور بیشتر لوگوں نے اس بات کو پھیلانا شروع کر دیا کہ وہ اب خود ارتکازی کا شکار ہوگیا ہے۔ وہ خودغرض اور بے فیض ہوگیا ہے۔ اس کے رفیقوں نے جو اُس کے باطنی تلاطم اور ہیجان سے ناواقف تھے، اس کا بائیکاٹ کرنا شروع کر دیا۔ جگہ جگہ اُس کی کردار کشی ہونے لگی۔ یہاں تک کہ اس کے ہم نشینوں نے اُسے اپنے حلقۂ کار سے یکسر خارج کر دیا۔

اسے اپنے لوگوں کے اس رویے سے زبردست ٹھیس لگی۔ اس کا دل ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا۔ اس نے چاہا کہ وہ اس رویے کے خلاف احتجاج کا راستہ اختیار کرے۔ لیکن وہ ایسا نہیں کر سکا۔ دراصل احتجاج کے لیے بھی اس وقت اس کے پاس قوت نہ رہی تھی۔ لہٰذا اس نے خاموشی اختیار کر لینا ہی بہتر سمجھا۔ اس نے سوچا کہ چلو ٹھیک ہے۔ اگر ان لوگوں کا میرے ساتھ یہی رویہ ہے اور وہ برسوں کی میری قربانی کو رائیگاں کر دینا چاہتے ہیں تو وہ ان کے اس میکانکی رویے کے خلاف خواہ مخواہ کی زور آزمائی کیوں کرے گا؟ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اب خود کو محدود کر لے گا۔ سماجی سرگرمیوں سے الگ ہوکر گوشہ گیر ہو جائے گا۔ لہٰذا اس نے یہی راستہ اختیار کیا۔ وہ خود کو خاص نگہداشت میں کالج لے جاتا اور وہاں اپنے کو فقط درس و تدریس کے کاموں میں مصروف رکھتا۔ کسی بھی قسم کی فضول گوئی اور شکوہ و شکایت میں حصہ نہیں لیتا۔ سماجی و سیاسی گفتگو جو کبھی اس کے محبوب موضوعات ہوا کرتے تھے، اب وہ ان پر بھی رائے زنی نہیں کرتا۔ کالج سے سیدھا گھر واپس آتا۔ وہ اس قدر مردم گزیدہ ہو

چکا تھا کہ راستہ بھی ایسا اختیار کرتا کہ کسی مانوس اور شناسا فرد سے سامنا نہ ہو۔ ایک طرح سے وہ ذہنی جلاوطنی اختیار کر چکا تھا۔ اب اس میں کسی بات کے لیے دلچسپی باقی نہیں رہ گئی تھی۔ اس نے بازار جانا بھی کم کر دیا تھا۔ چوک چوراہوں پر بیٹھنا اور دوستوں کے ساتھ گپ بازی کرنا، جو فرصت کے اوقات میں اس کا محبوب مشغلہ تھا وہ سب سلسلے مفقود ہو چکے تھے۔ وہ بازار نکلتا بھی تو بہت اشد ضرورت پیش آنے پر اور پھر فوراً ہی سر جھکائے واپس آ جاتا۔ اگر کوئی شناسا روبرو ہو جاتا تو وہ بڑی مشکل سے ان سے چند باتیں کر لیتا۔ لوگ پوچھتے۔ ان دنوں کہیں نظر نہیں آتے ہو؟ کسی سرگرمی میں دکھائی نہیں پڑتے۔'' تو وہ کسی کی شکایت نہیں کرتا۔ کسی کے خلاف غم و غصے کا اظہار نہیں کرتا۔ اپنے ساتھ ہوئی بدسلوکی اور ناانصافی پر ذرا بھی احتجاج نہیں کرتا۔ بس دبی زبان میں یہی کہتا کہ ''طبیعت ٹھیک نہیں رہتی ہے'' گھر میں لوگ خوش گپیوں میں مصروف رہتے۔ کبھی افرادِ خانہ زندگی کے ہنگاموں میں شریک رہتے۔ لیکن وہ آنکھیں بند کر کے لیٹا رہتا۔ وہ اپنے خالی اوقات میں اسی طرح آنکھیں بند کر کے لیٹ جانے کا عادی ہو چکا تھا۔ اس وقت وہ دنیا کے اسرار و رموز پر غور و فکر کرتا۔ اسے محسوس ہوتا کہ سب کچھ بے کار ہے۔ ساری ہنگامہ آرائیاں فضول ہیں۔ موت ہی سب سے بڑی حقیقت ہے۔ دوستوں کی بے وفائی اور ان لوگوں کے نامناسب رویے سے وہ حد درجہ متاثر ہوا تھا اور اس حالت نے اس کے ذہن میں فرار کی کیفیت پیدا کر دی تھی۔ اس کا ذہن اکثر ماؤف ہو جاتا تھا۔ وہ آنکھیں بند کیے خلا کو گھورتا رہتا۔ سامنے اُسے مکمل تاریکی نظر آتی۔ دن ہوتا تو آفتاب پگھل کر کوئی سیال مادہ بن جاتا اور شب ہوتی تو روشن ماہتاب اور درخشاں ستارے دھواں دھواں نظر آتے۔ اس حالت میں اگر وہ اپنے وجود کی تلاش کرتا تو اُسے بڑی مایوسی نصیب ہوتی۔ وہ خود کو معلق محسوس کرتا۔ اُس وقت اس کی آنکھوں میں نہ کوئی خوش رنگ پرندہ ہوتا۔ نہ رواں دواں ندی ہوتی اور نہ ہی بدلتے موسموں کے رنگ ہوتے۔ اب رنگ برنگی تصویروں کا آنکھوں میں اُتر آنا دشوار

ہو چکا تھا۔

یوں وقت گزرتا رہا اور وہ اسی انداز میں اپنی زندگی بسر کرتا رہا اور اسی طرح اس کی زندگی کا خاتمہ ہو جانا چاہیے تھا لیکن حالات کو کچھ اور منظور تھا۔ ایک حادثے نے اس کی زندگی کے رخ کو ایک بار پھر متاثر کیا۔ ہوا یہ کہ ایک شب ایک خواب اس کی آنکھوں میں در آیا اس نے خواب کے منظر میں خود کو اپنے قصبے میں موجود پایا۔ وہاں اس نے دیکھا کہ اس کا ایک ساتھی لہو میں غرق زمین پر پڑا ہوا ہے۔ اس شخص کا جسم بے حرکت تھا۔ آنکھیں بے نور ہو چکی تھیں۔ لب خاموش تھے۔ لیکن اس وقت بھی اس کے دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں تنی ہوئی تھیں۔ اس لہولہو خواب نے اسے نیند سے بیدار کر دیا۔ وہ بستر پر پڑا چھت کو تاکتا رہا۔ لیکن اس وقت اس کی آنکھوں میں نہ پگھلا ہوا آفتاب تھا اور نہ ہی دھواں دھواں ماہتاب بلکہ وہ زندگی کی اس شاہ راہ سے گزر رہا تھا جہاں کہ اس کے ایک ساتھی کو علاقے کی زمیندارانہ باقیات کے چند عناصر نے اپنے غنڈوں سے قتل کروا ڈالا تھا۔ وہ آدمی کھیت مزدوروں کی اُجرت میں اضافے کی تحریک کی رہنمائی کرر ہا تھا۔ وہ اس قدر حوصلہ مند شخص تھا کہ قتل ہو جانے کے باوجود اپنے عزائم کو اپنی بے جان مٹھیوں میں مضبوطی سے جکڑے ہوئے تھا۔ وہ اس شب اپنے ساتھی کے لہولہان چہرے کو آنکھوں میں سجائے دیر تک روتا رہا تھا۔ اس دوران کئی سوال اس کے ذہن میں کوندے۔ اُسے محسوس ہوا کہ ابھی اس وقت بھی اس کا وہی ساتھی اس کے سامنے کھڑا ہے اور اُس سے کچھ جواب طلب کر رہا ہے۔ دونوں نے تعلیم حاصل کرنے کے بعد ایک ساتھ ہی عوام کے لیے لڑنے مرنے کی قسمیں کھائی تھیں۔ لیکن اس وقت وہ کہاں ہے؟ یہ سوال نشتر کی طرح اس کے ذہن میں چبھا۔ وہ بے چین ہو گیا اور بہت دیر تک مضطرب رہا۔ آخر جب ذہنی کشمکش سے نجات ملی تو اُسے سکون حاصل ہوا۔ شاید اُسے کھویا ہوا سنکلپ واپس مل گیا تھا۔ رفتہ رفتہ پھر اُسے نیند آ گئی اور جب وہ بیدار ہوا تو موسم برسات کی طرح دھلی ہوئی خنک صبح نمودار ہو چکی تھی۔

ضروریات سے فارغ ہو کر وہ اخبار دیکھنے لگا۔ اس نے بہت دنوں کے بعد پہلی بار غائر انداز
میں اخبار کو دیکھا تھا۔ وہ شہ سرخیوں کے بعد مقامی خبروں کی طرف رجوع ہوا۔ ایک خبر کے
مطالعے کے بعد فکر مندی کے اثرات اس کے چہرے پر نمایاں ہونے لگے۔ اخبار کو میز پر رکھ کر وہ
بیوی سے مخاطب ہوا۔ ''میرا ناشتہ تیار کر دو۔'' بیوی اس میں رونما تغیر کو واضح طور پر محسوس کر رہی
تھی۔ اس نے دریافت کیا۔ ''خیریت تو ہے آج فرصت کے روز اس قدر سویرے ناشتہ
کریں گے؟'' بیوی کے سوال کا جواب دینے کے بجائے اس نے خود ہی بیوی سے پوچھ ڈالا۔
''کیا تم لوگوں کو معلوم نہیں ہے کہ کل شہر میں ایک بچے کو اغوا کر لیا گیا ہے اور اس واقعے کے خلاف
بطور احتجاج آج ایک ریلی منظم کی جا رہی ہے۔؟'' بیوی نے کہا: ''جی ہم لوگوں کو معلوم ہے کل ہی
سے یہ خبر شہر میں گشت کر رہی ہے۔ پھر اس نے ذرا رک کر پوچھا۔ ''لیکن ان واقعات سے اب
آپ کا کیا تعلق؟'' شرٹ کا بٹن لگاتے ہوئے اس نے بیوی کو جواب دیا ''میں بھی اس ریلی
میں حصہ لوں گا۔'' اس کے ارادے کو دیکھ کر بیوی چونک پڑی کہ برسوں بعد اس کے دل کی شاخ
میں یہ شگوفہ پھر کہاں سے پھوٹا۔

ناشتے سے فارغ ہو کر وہ گھر سے نکلا۔ راستے میں اُسے خیال آیا کہ وہاں اُس کے پرانے ساتھی بھی
آئیں گے۔ کیا وہ ان لوگوں کا سامنا کر سکے گا یا انھیں دیکھ کر اس کے دل میں نفرت کے جذبات
پیدا ہوں گے۔ اس نے سوچا کہ وہ ایسا نہیں ہونے دے گا۔ اُس وقت وہ کسی کی پرواہ نہیں کرے
گا۔ وہ خود کو جذبات کے گرداب میں الجھنے نہیں دے گا اور مایوسی و فرار کی کیفیت سے خود کو آزاد
رکھے گا اور پھر وہ کسی کے کہنے پر تو نہیں جا رہا ہے بلکہ وہ اپنے دروں کو لبیک کہہ رہا ہے۔ بہت
ہو چکا۔ اس نے خواہ مخواہ اپنا بہت سارا وقت جذبات کا اسیر ہو کر ضائع کر دیا۔ اس نے چند اشخاص
کے رویے کو اپنے دل کی گانٹھ بنا لیا تھا۔ حالانکہ اُسے اپنے ناموافق حالات کا مقابلہ کرنا چاہیے تھا
اور تمام حالات کو وسیع تناظر میں دیکھنا چاہیے تھا۔ اپنے ساتھیوں کی غلط فہمی کو وہ دور کر سکتا تھا۔

بہرحال اس نے فیصلہ کیا کہ اس طرح سماج سے لاتعلق ہو کر جینا مناسب نہیں ہے۔ جہاں تک اس کے حالات اجازت دیں گے، جب تک اس کی قوت اس کا ساتھ دے گی، وہ اپنی سماجی افادیت کو برقرار رکھے گا اور زندگی کے مجادلے میں ضرور حصہ لے گا۔ افکار کے نشیب و فراز سے گزرتا ہوا وہ ٹاؤن ہال میں پہنچا۔ وہاں لوگ یکجا ہو رہے تھے۔ چند پرانے شناساؤں سے بھی اس کا سامنا ہوا۔ لیکن کسی نے اس پر توجہ نہ کی۔ پھر بھی وہ اس بات سے ذرا بھی دل گرفتہ نہیں ہوا بلکہ اس نے اپنی قوت کو مجتمع کیا اور صف کے آخر میں جا کھڑا ہوا۔ ریلی نے بہت دیر تک گشت لگائی۔ شناسا سڑکیں اور گلیاں اس کی نظروں کے سامنے سے ایک بار پھر گزرتی رہیں۔ وہ مکمل اعتماد کے ساتھ آخری لمحوں تک ریلی کے ساتھ بڑھتا رہا اور ہر قدم پر اُسے ایک نئی زندگی کا لطف ملتا گیا۔

درودیوار

اس مکان میں ہم لوگ بہت دنوں تک رہے۔ وہ ایک منزلہ مکان تھا۔ اس میں اوپر چڑھنے کے لیے تیرہ سیڑھیاں تھیں۔ ہم لوگ ان سیڑھیوں سے اس قدر مانوس ہوگئے تھے کہ آنکھیں بند کر کے بھی زینہ اترتے چڑھتے تو کبھی نہیں گرتے اور نہ ہی ٹھوکریں کھاتے۔ اول اول جب اس مکان میں ہم لوگ رہنے گئے تو چار بھائی بہن تھے۔ باجی، میں، توقیر اور نزہت، باقی بھائی بہن بعد میں پیدا ہوئے تھے۔ عفت گاؤں میں پیدا ہوئی تھی ہاں آفاق، جاوید اور اقبال اسی مکان میں پیدا ہوئے تھے۔

ان دنوں ابا ایک چھوٹی عدالت کے دفتر میں ملازم تھے۔ وہ بے چارے دن رات دفتر کے کاموں میں مصروف رہتے تھے۔ صبح دفتر جاتے، شام کو واپس آتے۔ گھر پر بھی فائلیں لاتے اور وہاں بھی روزانہ دو تین گھنٹے ضرور کام کرتے تھے۔ ان کی ایک چھوٹی سی میز تھی جس پر وہ فائلیں رکھ کر کام کیا کرتے تھے۔ ان کا ایک رول بھی تھا جس سے وہ کاغذ پر پنسل سے لکیریں کھینچتے اور کبھی کبھی ہماری غلطیوں پر اسی رول کو بطور ڈنڈا بھی استعمال کرتے۔ کاش! کہ اس ڈنڈے کو انھوں نے میرے لیے کچھ زیادہ ہی استعمال کیا ہوتا۔ مجھے نظر انداز کر دینے کی سزا نہ دی ہوتی۔ میری آزاد طبع کو انھوں نے بغاوت پر محمول کیا اور کہا۔ ''تم کو وہی سزا ملنی چاہیے جو ایک باغی کو ملتی ہے۔'' انھوں نے مجھے بطور سزا نظر انداز کر دینے کا طریقۂ کار اپنایا۔ میرے سکھ دکھ سے خود کو اور اپنے مسائل سے مجھ کو الگ کر دیا۔ باغی ایک بار صلیب پر چڑھایا جاتا ہے۔ ایک بار زہر کا پیالہ پیتا ہے۔ ایک بار فصیلوں سے گرایا جاتا ہے۔ لیکن ابا نے مجھے نظر انداز کر کے ایسی سزا دی ہے کہ میں

انگنت بار صلیبوں پر چڑھا ہوں۔ اب تک ڈھیر سارے زہر کے پیالے پی چکا ہوں۔ کئی بار فصیلوں سے گرایا جا چکا ہوں۔ وہ ڈنڈا بہت دنوں تک مکان میں ادھر اُدھر بھٹکتا رہا تھا۔ اس پر جب بھی میری نظر پڑتی تو میرے دل میں کرب کی لہریں اُبھر جاتیں۔ اگر میں نظر انداز نہ کر دیا جاتا تو شاید میرا رنگ وروپ اتنا نہ بگڑتا۔ لیکن اس میں ابا کا قصور کیا تھا؟ وہ تو ان کی تھکا دینے والی محنت ان کی معاشی مشکلات اور ان کے جسم سے لگی مختلف بیماریوں کا فطری ردِعمل تھا۔ ابا ہمیشہ بیمار رہتے۔ بیماری کی حالت میں بالکل ہانپتے ہوئے خاندان کا بھاری بوجھ تنہا ڈھوتے رہتے۔

امی بھی ہم لوگوں کے ساتھ اسی مکان میں رہا کرتی تھیں۔ ابا دفتر کی فائلیں ڈھوتے اور امی خانہ داری کے مسائل دیکھتیں۔ امی صحت مند تھیں۔ ان کے بال سیاہ تھے۔ وہ بہت باوقار عورت تھیں۔ لیکن انھوں نے بہت دکھ جھیلا تھا۔ بہت مصیبتیں اٹھائی تھیں۔ جاڑے کی سرد راتوں کو بوسیدہ لحاف میں گزارا تھا۔ پھٹے پرانے کپڑوں میں ماہ و سال بتائے تھے۔ گزرے ہوئے شب وروز کی یادیں میرے دل کے کونے کونے میں محفوظ ہیں۔ اگر اس مکان کے در و دیوار اور ان کی بے زبان اینٹوں کو قوت گویائی مل جائے تو وہ بھی ان کہانیوں کو دہرا سکتی ہیں۔ مگر ڈر ہے کہ ان کی زبانیں تھک جائیں گی۔ ان کے چہرے آنسوؤں میں ڈوب جائیں گے۔

ابا کی تنخواہ بہت قلیل تھی۔ جو کچھ بھی ملتا۔ وہ مہینے کے شروع ہی میں ختم ہو جاتا۔ بنیے، دھوبی ڈاکٹر، اسکول اور کالج کے حسابوں میں خرچ ہو جاتا۔ پھر پورا مہینہ اگلے مہینے کی تنخواہ کی امید میں گزرتا۔ اس وقت محسوس ہوتا کہ یہ انتظار کتنا کٹھن ہے! اس درمیان انگنت بار ذلت سہنی پڑتی۔ ارمانوں کا قتل ہوتا۔ ہمارے ارمان بھی کتنے بے قدر اور کتنے بے سروپا تھے کہ ان کی چیخیں مکان کے در و دیوار میں گم ہو جاتیں۔ ابا کو دفتر سے آنے میں دیر ہو جاتی تو امی اوپر سے جھانک کر ان کی راہ دیکھتیں۔ ابا آتے تو وہ ان سے کچھ پوچھتیں۔ ابا دھیرے سے جواب دیتے۔ امی ان کا جواب سن

کراداس ہوجایا کرتیں۔ پھر وہ مجھ سے یا توقیر سے مخاطب ہوتیں۔ ''جاؤ بنیے کے یہاں سے ادھار لے آؤ۔'' ہم دونوں جھجکتے۔ امی ہمیں پچکارتیں۔ ہم خاموشی سے اٹھ کر بنیے کے پاس جاتے۔ وہ ہمیں دیکھتا اور نظر انداز کر دیتا۔ ہم دیر تک اس کے پاس بیٹھے رہتے۔ وہ تمام گاہکوں کو نپٹا لیتا، تب ہمیں پوچھتا۔

''پھر آئے ہو۔''

''جی۔''

''ادھار لوگے؟''

''جی۔''

'''باقی پیسے۔''

''جلد ہی دے دیں گے۔''

وہ اتنی باتوں کے بعد پھر دوسرے کاموں میں مشغول ہو جاتا۔ ہم بیٹھے رہ جاتے۔ ایسا لگتا کہ وہ ہمیں بھول گیا ہے۔ کچھ دیر بعد جب ہم اسے یاد دلاتے تب وہ ہماری طرف متوجہ ہوتا اور ہمیں کچھ سامان دے دیتا۔ ہم دونوں (میں اور توقیر) گھر واپس آتے۔ امی ہماری منتظر ہوتیں۔ گھر پہنچنے کے بعد ہی ہمارے گھر سے دھواں نکلتا۔ اس وقت تک پڑوسیوں کے گھر کا دھواں ماحول میں جذب بھی ہو چکا ہوتا۔

ایک دن امی کے پاس ایک بھی پیسہ نہیں تھا۔ ابا بھی خالی ہاتھ تھے۔ میں دن بھر اپنے خوش حال رشتہ داروں کے دروازے کھٹکھٹا کر نامراد واپس آچکا تھا۔ بنیے نے بھی ادھار دینے سے انکار کر دیا تھا۔ امی اس روز بہت فکر مند تھیں۔ انھیں اتنا فکر مند اور اس قدر اداس میں نے قبل کبھی نہیں دیکھا تھا۔ دن ڈھلا۔ شام ہوئی۔ رات کے نو بج گئے۔ امی کے چہرے کی اُداسی بڑھتی گئی۔ انھوں نے

آخری کوشش کی۔ساجدہ بوا کا مکان بغل ہی میں تھا۔وہ لکڑی کے کھلونے بنانے کا کام کیا کرتی تھیں۔امی کی آواز سن کر ساجدہ بوا ہمارے یہاں آئیں۔امی نے ان سے کہا۔

''بوا میں بہت پریشان ہوں۔''

''کیا ہوا بہن؟''

امی نے پوری باتیں سنائیں۔بوا واپس گئیں اور تھوڑی دیر بعد کچھ روپے لے کر آئیں تب ہمارے یہاں چاول آیا تھا۔دال آئی تھی، آلو آیا تھا۔ماضی کی بہت سی باتیں بھول چکا ہوں اور زمانے کی تیز دھوپ باقی یادوں کو جھلسا دینے پر آمادہ ہے۔لیکن درد کی وہ رات ایسی تھی جسے وقت کی تیز آندھی بھی اوجھل نہیں کر پائے گی۔شاید بے کسی کی اس رات ہی نے میرے ذہن کے دریچوں کو وا کر دیا ہے۔شعور کے ہزاروں چراغ جلا دیے ہیں۔میں اُس رات کی یادوں کو اب بھی آنسوؤں سے دھودھو کر تازہ رکھتا ہوں۔

اس مکان کے نچلے حصے میں رمیش چاچا کا خاندان رہا کرتا تھا۔وہ ایک سیٹھ کے یہاں منشی تھے۔پردیپ بھائی، کلدیپ بھائی اور امردیپ بھائی، ہم لوگوں سے قدرے بڑے تھے لیکن چاچا کے دوسرے بیٹے راجیش، برجیش اور راجندر، میرے، توقیر اور آفاق کے ہم عمر تھے۔عمر کی مناسبت سے ہم لوگوں میں دوستی ہوگئی تھی۔راجیش میرا برجیش توقیر کا اور راجندر آفاق کا دوست بن گیا تھا۔ہم لوگوں نے برسوں دوستی کے تمام آداب...... ساتھ رہنا، لڑنا جھگڑنا اور پھر سب کچھ فراموش کر کے ایک ہو جانا خوب ادا کیے تھے۔وقت کی خلیج کتنی گہری ہے۔مسائل کی پیچیدگیوں کا جال کتنا پھیلا ہوا ہے کہ ہم چاہ کر بھی اسے سمیٹ نہیں سکتے۔اب ہم لوگ اس طرح بکھر چکے ہیں کہ ساتھ رہنے،لڑنے جھگڑنے اور پھر سب کچھ بھول کر یکجا ہونے کے لیے ترس رہے ہیں۔اب تو کہیں کسی شہر میں، کسی سڑک کے کنارے اچانک آمنے سامنے ہو جانا۔کاندھوں پر پڑے بوجھ کو ہلکا کر کے،

چند گھڑی باتیں کر لینا اور پھر آگے بڑھ جانا، زندگی کا دستور بن گیا ہے۔ چاچی اور امی میں خوب نبھتی تھی۔ ابا دفتر اور چاچا سیٹھ کے کاموں میں چلے جاتے تو امی اور چاچی گھنٹوں ایک دوسرے سے باتیں کرتیں۔ اس وقت دونوں اپنے اپنے بچوں کے گرد سپنوں کے ہالے بناتیں۔ امی نے سپنوں کے پورا ہونے کا انتظار نہیں کیا اور مجھے معلوم ہے کہ چاچی کے خواب بھی تکمیل کے مراحل تک نہیں پہنچ سکے ہیں۔ ان کے بیٹے، ان کے ارمانوں کے چاند، ضرورتوں کی شدت اور بے روزگاری کی مار میں کھو کر رہ گئے ہیں۔

نیچے کی تیرہ سیڑھیاں اور اوپر کی پندرہ سیڑھیاں چڑھتے اترتے آٹھ دس برس گزر گئے۔ گھر میں باجی کی شادی کی فکر ہونے لگی تھی۔ میں انٹر میں پہنچ گیا تھا۔ توقیر اسکول کے آخری سال میں تھا۔ ابا تو بیمار تھے ہی۔ امی بھی بیمار رہنے لگی تھیں۔ ان کا صحت مند جسم سوکھ کر کانٹا ہو گیا تھا۔ وہ دن بھر بستر پر پڑی چھت کو تاکتی رہتیں۔ اس دن ابا گھر میں نہیں تھے۔ گھر میں فقط امی اور ہم سب بھائی بہن ہی تھے۔ صبح ہی سے امی کی طبیعت کچھ زیادہ خراب تھی۔ میں ان کے پاس ہی تھا۔ بیماری کی حالت ہی میں وہ مجھ سے باتیں کرتی رہیں۔ باجی کی شادی کی باتیں، رشتے داروں کا ذکر اور میرے دوستوں کا چرچا وغیرہ۔ میں نے انٹر کا امتحان دیا تھا۔ انھیں میرے ریزلٹ کی بھی فکر تھی۔ پھر اچانک ان کی سانسیں اکھڑ گئیں اور ان کے لیے باتیں کرنا مشکل ہو گیا۔ وہ بولنے کی کوشش کرتیں۔ لیکن الفاظ ان کے منہ سے نکل نہیں پاتے اگر کسی طرح نکلتے بھی تو ان کی سانسوں ہی میں گھل کر رہ جاتے۔ اس وقت ہم لوگوں میں کوئی بھی ہوش مند ہوتا تو امی کو بچایا جاسکتا تھا۔ لیکن ہم لوگوں میں سے کسی نے اب تک موت کی آمد کو نہیں دیکھا تھا۔ آدمی کے مرنے کا کوئی تجربہ ہمارے پاس نہیں تھا۔ رات کے تین بجے جب امی کی حالت بالکل خراب ہوگئی تو ہم لوگوں نے ڈاکٹر کو بلایا۔ راجیش بھی ہمارے ساتھ ڈاکٹر کو لانے گیا تھا۔ ڈاکٹر نے چند دوائیاں تجویز کی تھیں۔ ایک انجیکشن بھی دیا تھا۔ لیکن سب بے سود! ہم لوگ رونے لگے تھے۔ رونے کی آواز سن کر چاچی

بھی آ گئی تھیں۔ انھوں نے امی کو پانی پلایا۔ پانی کا آخری قطرہ چاچی کے ہاتھوں ہی امی کے حلق میں اترا تھا۔ صبح ہوئی تو ماموں جان بھی غم زدہ اور آب دیدہ شہر آ گئے تھے۔ ان کے آنے کے بعد ہم لوگ امی کو گاؤں لے گئے تھے جہاں انھیں سپرد خاک کر دیا گیا تھا۔

اس کے بعد اس مکان میں ایسی اداسی آ بسی کہ پھر ہم لوگ مسکرا نہ سکے۔ آنے والے تین چار برس طوفان کی طرح گزر گئے۔ بعد میں اس مکان میں صرف ابا، میں اور توقیر رہ گئے تھے۔ باقی بھائی بہن پہلے ہی گاؤں جا چکے تھے۔ ایک سال بعد ابا کا تبادلہ دوسری جگہ ہو گیا تھا۔ اگلے سال توقیر نے بھی اس مکان کو چھوڑ دیا تھا۔ دو برسوں کے بعد میں نے سامنے کے دو کمروں کو خالی کر کے چاچا کے خاندان کو دے دیا تھا۔ کچھ دنوں کے بعد میں نے ایک کمرہ اور خالی کر دیا۔ چاچا اوپر کے حصے میں چلے آئے۔ میں ان لوگوں کے ساتھ رہنے لگا۔ ان کے یہاں ہی کھانا کھاتا۔ بیمار پڑتا تو چاچا فکر مند ہو جاتے۔ بارہا میری خیریت دریافت کرتے۔ چاچی رات گئے تک پنکھا جھلتی رہتیں۔ چند مہینوں کے بعد جب اس شہر میں میری تعلیم مکمل ہو گئی تو میں نے پورا مکان چاچا کے سپرد کر دیا اور برسوں کی آشنا سیڑھیوں کو شمار کرتا ہوا۔ نیچے اتر آیا۔ ہمیشہ کے لیے!

میں نیچے اتر آیا ہوں اور میں نے زندگی کا لمبا سفر بھی طے کر لیا ہے۔ اب وہ شہر اور وہ مکان بہت پیچھے چھوٹ چکا ہے۔ لیکن اس مکان کی سیڑھیاں، کمرے، در و دیوار، جھروکے، برآمدے، آنگن، چھت اور وہاں گزرے روز و شب اور ان سے وابستہ یادیں، اب تک میرے ساتھ ہیں۔ میری راتیں کہیں بھی گزری ہوں لیکن میرے خوابوں کا مرکز وہی مکان رہا ہے۔ میں نے اُسی مکان میں کسی کو ڈانٹا ہے۔ کسی کے ساتھ پیار کیا ہے۔ رویا ہوں۔ ہنسا ہوں۔ میں جہاں بھی رہا ہوں۔ میں نے خود کو وہیں پایا ہے۔ ابا، باجی، توقیر، نزہت اور آفاق کے خوابوں میں بھی وہی مکان رچا بسا ہوگا۔ ہاں عفت، جاوید اور اقبال کے متعلق میں نہیں کہہ سکتا۔ کیونکہ اس وقت وہ لوگ بہت چھوٹے تھے۔ ان کی آنکھوں میں ویسا کچھ بھی نہیں ہو یا شاید دھندلا دھندلا سا کچھ ہو۔

دھوپ کی لکیریں

وہ ایک ایسی جگہ جا رہی تھی جہاں جاتے ہوئے خوشی کی جگہ تجسس اور تشویش کا احساس اس پر طاری ہوگیا تھا۔ یہ احساس منزل کے قریب تر ہونے کے ساتھ بتدریج بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ گھبراہٹ اس وقت اور سوا ہوگئی تھی جب حویلی کی چہار دیواری میں اس نے قدم رکھا تھا۔ باہر کی بیٹھک کے سامنے سے گزر کر حویلی کے صدر دروازے تک پہنچتے ہی اُسے ایسا محسوس ہوا کہ وہ مختلف جذبات کی گرفت میں آ گئی ہے۔ رکشے والے نے گھنٹی بجا کر اُسے منزل پر پہنچنے کی اطلاع دی۔ اس نے پردہ اٹھا کر دیکھا: سامنے وہی جانا پہچانا دروازہ تھا، جسے وہ بہت قبل فراموش کر چکی تھی اور جس کے دوبارہ یاد آنے کی گنجائش بھی اب باقی نہیں بچی تھی۔ اُسی وقت کسی نے اُسے مخاطب کیا۔ ''آؤ بیٹی! اندر آجاؤ'' جھریوں بھرا ایک چہرہ اس کے استقبال کے لیے سامنے موجود تھا۔ وہ انھیں دیکھ کر کانپ گئی۔ اس وقت تک گھر کے دیگر افراد بھی آپہنچے تھے۔ ان میں کچھ حسرت، کچھ پیار اور کچھ تجسس سے اس کی طرف تاک رہے تھے۔ جب وہ رکشے سے اترنے لگی تو ضعیفہ نے اسے اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے سہارا دیا اور اس کی خیریت دریافت کی۔ ''بیٹی! اچھی تو ہو؟'' یہ آواز گرم سیسے کی طرح اس کے کانوں میں اترتی چلی گئی تھی۔

اسے یاد آیا کہ تقریباً تیس سال قبل یہی وہ جگہ تھی جہاں اسی طرح لوگ اس کے استقبال کے لیے دروازے پر کھڑے تھے۔ اس وقت گیتوں کی آواز اس کے کانوں میں رس گھول رہی تھی اور وہ خوب صورت کپڑوں میں ملبوس اور قیمتی زیوروں سے آراستہ، ڈولی میں بیٹھی ہوئی تھی۔ زندگی کا طرفہ تماشا تھا کہ اس وقت بھی یہی آواز تھی۔ لیکن آج کی طرح نحیف و زار نہیں بلکہ نغمگی اور

لطافت میں ڈوبی ہوئی، نقرئی گھنٹیوں کی طرح بجتی ہوئی......''بیٹی! ذرا اپنا منھ تو دکھاؤ میں تمہاری ساس ہوں'' یہ کہہ کر انھوں نے اس کے سر پر پڑے ساڑی کے پلو کو سرکا دیا تھا اور اس کے چاند جیسے چہرے کو دیکھ کر مسرور ہو گئی تھی۔ تب وہ بالکل لجا گئی تھی۔ پھر انھوں نے اس کے گلے میں سونے کا ہار ڈالتے ہوئے کہا تھا۔ ''لو بیٹی! خدا تمھیں سدا سہاگن رکھے۔'' اس کہنے میں کتنی محبت تھی، کیسی شفقت تھی۔ کتنا سرور تھا۔ ساری باتیں اس کے ذہن میں اس طرح تازہ ہو گئیں کہ وہ بالکل کل کی باتیں معلوم ہونے لگیں۔ اُس نے آگے بڑھ کر ضعیفہ کو سہارا دیا اور سامنے موجود لوگوں پر نظر دوڑائی۔ شناسا چہروں میں فقط ایک دو چہرے گذشتہ برسوں کی تپش آمیز دھوپ کو سہتے ہوئے اب تک موجود تھے اور باقی چہرے جن کو اس کی آنکھیں ڈھونڈ رہی تھیں، وہ اُسے نہیں ملے۔ شاید وہ زندگی کے دن پورے کر چکے تھے۔ جو نوجوان اور بچے وہاں موجود تھے۔ وہ اس کے لیے بالکل نئے تھے۔

وہ بوجھل انداز میں دھیرے دھیرے حویلی کے اندر داخل ہوئی۔ اندر بھی سب کچھ قبل جیسا ہی تھا۔ سوائے سامنے کے دو تین کمروں کے جو نیا بنا ہوا معلوم ہو رہا تھا اور جس نے کشادگی کو کم کر دیا تھا۔ وہ چاروں طرف سے یادوں کے ہجوم میں گھر گئی۔ اپنی جوانی کے دن، شادی کی باتیں اور شوہر کا مسکراتا ہوا چہرہ اسے یاد آیا۔ گذشتہ دنوں وہ اتنی مصروف رہی کہ بیتے دنوں کو ذہن میں کبھی جگا نہ سکی۔ لیکن آج وہ تمام باتیں جو برسوں قبل ماضی کے قبرستان میں دفن ہو چکی تھیں، وہ خود بخود زندہ ہونے لگی تھیں۔ اس نے اپنے مضطرب دل کو سہارا دیا اور حویلی کے اندر داخل ہوئی۔ اتنے میں پڑوس کی چند عورتیں بھی آ گئیں۔ ان میں کئی عورتیں اس کی شناسا تھیں اور باقی اجنبی۔ شناسا عورتیں اس کی خیریت وغیرہ دریافت کرنے لگیں۔ ضعیفہ نے اُسے حسرت بھری نگاہوں سے دیکھا اور کہا۔ ''دلہن آج تمھیں برسوں بعد دیکھا ہے۔ آج مجھے اپنے بیٹے کی یاد کچھ زیادہ ہی ستانے لگی ہے۔''

اتنا کہتے ہوئے ضعیفہ کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے اور ان کی آواز بھرا گئی۔ اس نے ضعیفہ سے پوچھا۔ ''اماں! آپ کیسی ہیں؟'' ضعیفہ نے اس کی باتوں کا کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ خاموش رہیں۔ ہاں فقط آنسوؤں کے چند قطرے ان کے جھریوں بھرے چہرے پر ڈھلک گئے۔ اس نے ضعیفہ سے پھر کچھ نہیں پوچھا۔ اُسے محسوس ہوا کہ شاید اس نے ان کے زخموں کو کرید ڈالا ہے۔

دن بیت چلا۔ سورج شفق کی سرخی میں گم ہونے کو تھا۔ وہ برآمدے میں بیٹھی ہوئی ڈھلتے ہوئے دن کو دیکھ رہی تھی۔ اس وقت باہر سے کوئی آواز دیتا ہوا اندر داخل ہوا۔ وہ چونک پڑی۔ اُف! یہ آواز تو بالکل جانی پہچانی ہے۔ گو کہ وقت نے تیس برسوں کا طویل فاصلہ طے کر لیا تھا لیکن وہ اس آواز کو اب تک فراموش نہیں کر سکی تھی۔ اسے محسوس ہوا کہ وہ آرہے ہیں۔ لیکن ذہن میں تصورات کے سایے صرف چند لمحوں کی حیات پا کر ایک چھناکے کے ساتھ ٹوٹ گئے۔ اس نے بڑی مشکل سے نظریں اٹھا کر دیکھا۔ اس کا چھوٹا دیور اس کے سامنے کھڑا تھا۔ وہ متعجب نگاہوں سے اُسے دیکھ رہا تھا۔ جب ضعیفہ نے اسے سب کچھ بتایا تو اس نے کچھ مسکراہٹ لاتے ہوئے اور کچھ حزن وملال کو چھپاتے ہوئے اسے سلام کیا اور پھر مخاطب ہوا۔ ''بھابی! میں کھیت گیا ہوا تھا مجھے نہیں معلوم تھا کہ اتنے برسوں کے بعد آپ اس طرح ہمارے یہاں آئیں گی۔'' اس نے حسرت بھری نگاہوں کے ساتھ اپنے دیور کو دیکھا اور کہا۔ ''بچوں کی دوستی نے مجھے مجبور کر دیا کہ میں یہاں آؤں۔ زمانے کے کاروبار بھی عجیب ہیں۔'' یہ کہہ کر وہ خاموش ہوگئی۔

وقت گزرتا گیا۔ شام کی سیاہی رات کی تاریکی میں گم ہوگئی۔ کھانے سے فارغ ہو کر جب وہ سونے کے لیے کمرے میں گئی تو وہ کمرہ اُسے مانوس لگا۔ یادوں کے کچھ اور کانٹے اس کے ذہن میں چبھنے لگے۔ یہ وہی کمرہ تھا جس میں وہ دلہن بن کر آئی تھی اور اسی میں اُس نے مستقل پانچ چھ سال اپنے شوہر کے ساتھ قیام کیا تھا۔ بیتے دنوں کی یادیں چلتی پھرتی تصویروں کی طرح آنکھوں میں لہرانے

لگیں۔ شادی کا دن، اس روز کی چہل پہل، گلابی ریشمی جوڑا اور زیورات۔ اُسے سب کچھ یاد آ گیا۔ اس وقت وہ بالکل نازک سی لڑکی تھی۔ اس لیے وہ کپڑوں اور زیوروں کے بوجھ تلے دبی جا رہی تھی۔ وہ پسینے میں شرابور بھی ہو گئی تھی۔ جب وہ ڈولی سے اتاری گئی تھی تو نندوں اور دیوروں نے اُسے ہنسی مذاق سے پریشان کر دیا تھا۔ پھر جب رات ہوئی اور کمرے کے دروازے پر دستک دیتے ہوئے کسی نے پر مذاق انداز میں اُس سے دریافت کیا تھا ''میں اندر آؤں؟'' یہ آواز اس کے شوہر کی تھی، جسے سن کر وہ شرما گئی تھی۔ وہ کمرے کے اندر آ گئے تھے۔ اس کی ازدواجی زندگی کی وہ پہلی شب تھی۔ ارمانوں اور خوابوں میں بسی ہوئی، اس کی آرزوؤں کی پہلی رات۔ لیکن اب تو فقط یادیں تھیں۔ تیس سال پرانی یادیں۔

اُف! یہ یادیں بھی کتنی تلخ ہیں۔ یہ سوچ کر وہ اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے اٹھ کر اندر سے دروازہ بند کر لیا اور لالٹین کی روشنی دھیمی کر کے سونے کے لیے بستر پر دراز ہو گئی۔ لیکن بار بار کروٹیں بدلنے کے باوجود اسے نیند نہیں آئی۔ نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ بستر پر پڑی پڑی ایک بار پھر وہ یادوں کی اسیر ہو گئی۔ شادی کے بعد کے سہانے دن، شوہر اور ساس کی محبتیں۔ وہ ان دنوں کی یادوں میں محو تھی کہ اچانک اسے احساس ہوا کہ سامنے بستر پر پڑا کوئی سسک رہا ہے۔ وہ گھبرا گئی۔ اس نے جلدی سے اُٹھ کر دیکھا لیکن وہاں کوئی نہیں تھا۔ ایک بار پھر اُسے دھوکا ہوا تھا۔ اس کے ذہن کے پردے پر یادوں کے کچھ اور مناظر اُبھر گئے: اس کی شادی کا چوتھا یا پانچواں سال تھا۔ اس کے شوہر کے پیر میں ایک زخم ہو گیا تھا جو رفتہ رفتہ بھیانک شکل اختیار کر گیا تھا۔ اس کی تکلیف میں وہ مہینوں سسکے، تڑپے اور روئے تھے۔ اس دن سویرے ہی سے وہ اداس اور بے چین تھے۔ بار بار اسے اپنے نزدیک بیٹھنے کو کہتے اور حسرت و یاس بھری نگاہوں سے اُسے تکتے رہتے۔ اس روز اس کا دل کسی کام میں بھی نہیں لگا تھا۔ اُسے یاد آیا کہ اس کے شوہر نے

کس قدر الم ناک لہجے میں اس سے کہا تھا۔ ''زاہدہ! میرے پاس رہو، میں اب نہیں بچوں گا۔'' یہ کہتے ہوئے ان کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔ زندگی سے محبت کا عکس ان کے چہرے پر ابھر آیا تھا۔ اس نے روتے ہوئے اپنے شوہر کو دلاسہ دیا تھا اور بارگاہ خدا میں مصروف دعا ہو گئی تھی۔ لیکن انجام وہی ہوا۔ جس کا اظہار اس کے شوہر نے کیا تھا۔ شام ہوتے ہی ڈھلتے ہوئے دن کے سورج کی طرح اچانک اس کے شوہر کی زندگی کا سورج غروب ہو گیا تھا۔ شوہر کی زندگی کا آخری دن اور اپنے سہاگ کے خاتمے کی الم ناکیوں کو یاد کر کے اس کا دل بھر آیا تھا۔ وہ بہت غم زدہ ہوگئی۔ وہ رونے لگی، روتی رہی، بہت دیر تک روتی رہی۔ یہاں تک کہ سویرا ہو گیا۔

اس کے بیٹے احمد کی دوستی اس گھر کے ایک نوجوان رضوان سے ہوگئی تھی۔ رضوان نے اس کے بیٹے کی جان ایک حادثے میں بچائی تھی۔ اس واقعے کے بعد وہ رضوان کو بہت عزیز رکھنے لگی تھی۔ بیٹے کے اسی دوست نے اُسے اپنے یہاں آنے کی دعوت دی تھی۔ اس کے انکار پر اس نے شدید اصرار کیا تھا۔ ''اماں! آپ کو ہمارے یہاں آنا ہوگا۔ ورنہ میں بھی آپ کے یہاں آنا ترک کر دوں گا۔'' رضوان کے اصرار پر وہ مجبوراً تیار ہوگئی تھی۔ پھر اس نے یہ بھی سوچا کہ جو ہونا تھا وہ ہو چکا اور اب اس واقعے کو گزرے ایک زمانہ بھی گزر گیا ہے۔ اب تجدید تعلقات میں حرج کیا ہے؟ یہی سوچ کر اس نے رضوان کے یہاں جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ لیکن اب اس کے لیے یہاں ایک لمحہ بھی رکنا مشکل ہو رہا تھا۔ اس لیے کہ یادوں کے سلگتے کرب نے اسے بالکل پژمردہ کر دیا تھا۔ اُسے محسوس ہوا کہ یہاں یادوں کی سیاہ پرچھائیاں اس کے وجود کو ڈھک لیں گی اور بیتے دنوں کی یادیں اُسے متواتر کچوکے لگاتی رہیں گی۔ اس لیے وہ میزبان سے اجازت لے کر اپنے گھر کے لیے روانہ ہوگئی۔ رکشے پر چڑھتے وقت اُسے ایک بار پھر یاد آیا کہ برسوں قبل، وہ اس گھر سے، ٹھیک اسی وقت اپنے میکے کے لیے روانہ ہوئی تھی۔ جہاں اس کے والدین نے اسے روک لیا تھا اور چند مہینوں کے

بعد، اس کے نہیں چاہنے کے باوجود اس کی دوسری شادی کردی تھی۔

رکشہ کے چلتے ہی اس نے ساری یادوں کو پرے جھٹک دیا۔ اس وقت اس کا چہرہ کھل گیا تھا۔ اُسے گھر پہنچنے کی جلدی تھی جہاں اس کے شوہر اور اس کے بیٹے، اس کی راہ دیکھ رہے تھے۔

دھوپ کے مسافر

راجو نے اپنی صبح کا آغاز حسب معمول جوٹھے برتنوں کو دھونے سے کیا تو اس کی نظر سامنے میدان پر پڑی جہاں صبح ہی سے گہما گہمی تھی۔ ہوٹل کے سامنے سڑک تھی اور سڑک کے کنارے ایک میدان تھا جہاں اکثر لڑکے فٹ بال اور کرکٹ وغیرہ کھیلا کرتے تھے اور کبھی کبھی مختلف سماجی اور سیاسی تقریبات بھی منعقد ہوا کرتی تھیں۔ آج بھی اس میدان میں لوگوں کا آنا جانا جاری تھا۔ شامیانے، کرسیاں اور میزیں وغیرہ لائی جارہی تھیں۔ میدان میں کسی پروگرام کا ہونا کوئی نئی بات نہیں تھی۔ یہاں تو برابر کچھ نہ کچھ ہوتا ہی رہتا تھا۔ راجو نے اس میں کسی خاص دلچسپی کا مظاہرہ نہیں کیا اور جوٹھے برتنوں کو دھونے میں مصروف ہوگیا۔

سردی بلا کی تھی۔ پانی برف کی طرح ٹھنڈا تھا۔ راجو شرٹ اور ہاف پینٹ پہنے باہر کھلی ہوا میں بیٹھا منجمد کردینے والی ٹھنڈک میں برتن دھوتا رہا۔ میدان میں شامیانہ لگا۔ کرسیاں بچھائی گئیں اور میزیں لگائی گئیں۔ خوب صورت سا ایک دروازہ بنایا گیا۔ میدان کو رنگ برنگ کی جھنڈیوں اور مختلف قسم کے غباروں سے آراستہ کیا گیا۔ اتنا کچھ ہوتے ہوتے دن کے بارہ بج گئے۔ اس دوران راجو کئی بار ہوٹل کے اندر اور باہر آیا۔ دوپہر میں چائے کی فروخت کم ہوگئی تو مالک نے اسے باہر نل پر سے اندر بلالیا۔ جہاں وہ میزوں کو صاف کرنے لگا اور دن کا کھانا کھانے والے گاہکوں کو پانی پلانے لگا۔ اُسے یاد بھی نہیں رہا کہ میدان میں کچھ ہورہا ہے۔

جب دوپہر ڈھلی اور سہ پہر کا وقت شروع ہوا اور چائے، ناشتہ والے گاہکوں کی بھیڑ بڑھنے لگی تو مالک نے پھر راجو کو باہر نل پر بھیج دیا۔ باہر آتے ہی جب راجو کی نگاہ میدان پر پڑی تو وہ متعجب

ہوا۔ پورا میدان بچوں سے بھرا ہوا تھا۔ صحت مند اور خوش پوشاک بچے میدان میں جمع تھے۔ یہ بچے کسی باغ کے پھولوں کی طرح اپنا حسن اور اپنی تازگی بکھیر رہے تھے۔ بچے میدان میں مختلف قسم کے کھیلوں میں حصہ لے رہے تھے اور شامیانے میں بیٹھے ان کے والدین اپنے بچوں کی سرگرمیوں نیز ان کی کارکردگی سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ میدان کے باہر بہت ساری موٹر گاریاں لگی ہوئی تھیں اور خوانچے والوں کی بھیڑ جمع تھی۔ مزید لوگوں کا آنا ابھی بھی جاری تھا۔

راجو نے اس سے قبل اس میدان میں بہت سارے پروگراموں کو دیکھا تھا، بڑے بڑے فٹ بال میچ، نیتاؤں کی تقریریں، ڈرامے اور قوالیاں وغیرہ۔ لیکن اس نے ایک بھی پروگرام ایسا نہیں دیکھا تھا جس میں بچوں کی اتنی بڑی تعداد نے حصہ لیا ہو۔ راجو گو کہ کام میں مصروف تھا لیکن اس کی توجہ میدان کی طرف ہی تھی۔ اس وقت ایک بچہ کوٹ، پینٹ میں ملبوس اور کیپ لگائے اپنے والدین کے ساتھ ایک کار سے اُترا۔ وہ بچہ تو خوب صورت تھا ہی لیکن خوش لباسی نے اُسے اور بھی حسین بنا دیا تھا۔ بچہ مسکرایا تو ماں نے اسے پیار سے چوم لیا اور باپ بھی ہنستے ہوئے محظوظ ہوا۔ بچہ اپنے والدین کے ساتھ میدان میں داخل ہوا اور پھر رفتہ رفتہ نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ لیکن وہ منظر دیر تک راجو کی آنکھوں میں رقص کرتا رہا۔ اس منظر نے راجو کے دل کی خوابیدہ حسرتوں کو بیدار کر دیا۔ آٹھ دس مہینوں سے وہ اس ہوٹل میں ملازم تھا۔ جہاں شب و روز کی سخت محنت مالک کی گالیاں، گاہکوں کی ڈانٹ پھٹکار اور راتوں کے ڈراؤنے سپنے، اس کی زندگی کا حصہ بن گئے تھے۔ کبھی کبھی وہ اپنے خوابوں میں، روشن چاند اور جھلملاتے ستارے بھی پاتا۔ لیکن اس کے یہ خواب بالکل عارضی ثابت ہوتے اور وہ جلد ہی حقیقت کی دنیا میں واپس آ جاتا۔ دس بارہ برس کی اس کی مختصر سی زندگی کی جھولی میں یادوں کا جو سرمایہ موجود تھا، وہ بہت ہی محدود تھا۔ ان یادوں میں بس اسٹینڈ کا فٹ پاتھ، بھکارن ماں اور جھگی میں پڑا اپاہج باپ۔ بس یہی کچھ دھندلے دھندلے مناظر تھے۔ پہلے اس کے باپ کا انتقال ہوا تھا اور تب ایک موٹر کے حادثے میں اس کی ماں مرگئی تھی۔ ماں کی

موت اسے کچھ زیادہ یاد تھی۔ ماں جو گوشت کے لوتھڑے بن کر سڑک پر بکھر گئی تھی۔ راجو کا دل اس بھیانک حادثے کی یاد میں مضطرب ہو گیا۔ ان تلخ یادوں نے اس کے دل کو تڑپا دیا۔ اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

وہ اپنی مرحومہ ماں کی تصویر کو آنکھوں کے پردے میں سجانا چاہ رہا تھا کہ مالک کی کرخت آواز پردۂ سماعت سے ٹکرائی۔ ''راجو! جوٹھے باہر پھینک آؤ۔'' جی آیا مالک!'' کہہ کر وہ اندر گیا اور رکابیوں کی جوٹھن کو یکجا کر کے باہر پھینک آیا۔ جوٹھن پھینکتے ہی، اس پر پانچ چھ ادھ ننگے، سوکھے اور بدحال بچے جھپٹ پڑے جو کوڑے کے ڈھیر کے پاس ہی منڈلا رہے تھے۔ وہ پھینکے گئے پس خوردہ کھانوں سے مختلف اشیا کے ٹکڑے چن چن کر کھانے لگے۔ راجو کو ان بچوں پر ترس آیا۔ اس نے تصور میں خود کو بھی ان بچوں میں موجود پایا۔ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ وہ بھی تو بہت دنوں تک جوٹھے کھانوں پر زندگی بسر کر چکا ہے۔ جو اُسے اسی طرح بس اسٹینڈ ریلوے اسٹیشن اور ہوٹلوں کے سامنے کوڑے کے ڈھیر پر مل جایا کرتے تھے۔ درد کا احساس لیے وہ پھر نل پر آیا۔ میدان میں بچے دوڑ رہے تھے۔ دوڑ میں اول، دوم اور سوم آنے والے بچوں کو لوگوں نے گود میں اٹھالیا۔ انھیں چوما اور پیار کیا۔ دوڑ کے بعد دوسری طرح کے بھی کھیل ہوئے۔ ان کھیلوں میں بھی بچوں ہی نے حصہ لیا۔ اس کے بعد تمام بچے شامیانے میں جمع ہوئے۔ راجو غور سے دیکھتا رہا۔ وہ سوچنے لگا کہ کاش! وہ بھی ان بچوں میں ہوتا۔ اس کے ماں باپ بھی زندہ ہوتے۔ اس کے جسم پر بھی عمدہ کپڑے ہوتے۔ وہ بھی کسی اسکول کا طالب علم ہوتا۔ وہ بھی آج اپنے والدین کے ساتھ اس پروگرام میں شریک ہوتا اور ان کھیلوں میں حصہ لیتا۔ لیکن اسے یہ معلوم تھا کہ سارا تماشا خوش حال بچوں کے لیے ہے۔ غریب و نادار بچوں کے لیے کہیں کوئی اسکول نہیں ہے۔ کہیں کھیل کا میدان نہیں ہے۔ کہیں زندگی کی خوشیاں نہیں ہیں۔ ان کا بچپن تو تاریک گلیوں میں بھٹک رہا ہے۔ یہ

لوگ دھوپ کے مسافر ہیں۔ ان لوگوں کے لیے تو دو وقت کی روٹی حاصل کرنا ہی سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ اس مقصد کی تکمیل کے لیے اُنھیں اپنے ماں باپ کے کاموں میں ہاتھ بٹانا ہوتا ہے یا خود بھی کہیں مزدوری کرنی پڑتی ہے۔ وہ اپنے خیالات کے خارزار میں بھٹک رہا تھا کہ اسی وقت ڈھیر ساری جوٹھی پیالیاں نل پر جمع ہوگئیں اور راجو انھیں دھونے میں مشغول ہوگیا۔

شام ہونے کو تھی۔ گاہکوں کی بھیڑ میں اضافہ ہونے لگا تھا۔ گاہکوں کی بھیڑ، سامنے پڑے جوٹھے برتنوں کے ڈھیر اور اپنی طرف گھورتی ہوئی مالک کی بڑی بڑی آنکھیں دیکھ کر راجو سہم گیا اور کام میں مصروف رہا۔ لیکن اس کا ذہن تو کہیں اور تھا۔ وہ منعقد تقریب کے ہر لمحے سے لطف اندوز ہونا چاہ رہا تھا۔ کھیل ختم ہونے کے بعد مہمان خصوصی کی تقریر ہوئی۔ تقریر دیر تک ہوتی رہی۔ آواز ہوٹل تک صاف آرہی تھی۔ راجو بغور سنتا رہا۔ اس نے باتوں کو سمجھنے کی کوشش کی۔ مگر چند ہی باتیں اس کے ذہن میں محفوظ ہوسکیں۔ شاید بچوں کی فلاح و بہبود کی باتیں ہورہی تھیں۔ کسی بال دیوس وغیرہ کا ذکر ہورہا تھا۔ وہ جاننا چاہ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہورہا ہے؟ کس طرح کی باتیں ہورہی ہیں؟ ان کا مقصد کیا ہے؟ لیکن وہ کچھ بھی سمجھنے سے قاصر تھا۔ لہٰذا نہیں سمجھ سکنے کے تکلیف دہ احساس سے تڑپ اٹھا۔ مالک نے آواز دی۔ ''راجو! جلدی برتن دھوؤ۔''

''جی۔ دھورہا ہوں......'' کہہ کر اس نے اپنا دل کام میں لگانے کی کوشش کی۔ لیکن ابھی چند ہی پیالیاں دھوسکا تھا کہ اس کی بے چین نگاہیں پھر میدان کی طرف مرکوز ہوگئیں۔ اب بچوں میں مہمان خصوصی کے ذریعہ انعامات تقسیم کیے جارہے تھے۔ کتابیں، کاپیاں، قلم اور کھلونے وغیرہ۔ بچے انعام قبول کرتے۔ انعام تقسیم کرنے والے شخص سے مصافحہ کرتے اور شامیانے میں موجود ان کے والدین تالیاں بجا کر اپنی بے پناہ مسرت کا اظہار کرتے۔ راجو کی اُداس نگاہیں، اس پرکشش منظر میں محو ہوگئیں۔ اس کی آنکھوں میں ایک قوس قزح اُبھر آئی۔ اس کا چہرہ کھل اُٹھا۔ اس

کا دل چاہا کہ وہ جوٹھے برتنوں کو یہیں زمین پر پڑا رہنے دے اور ہوٹل سے نکل بھاگے اور دوڑ کر ان بچوں میں شامل ہو جائے۔ انھیں کی طرح ہنسے۔ انھیں کی طرح اچھلے کودے اور آزاد فضا میں سانس لے سکے۔ وہ ایسا سوچ رہا تھا کہ مالک نے ایک زوردار طمانچہ اس کے گال پر لگایا اور چلایا۔

''کام کرتا ہے یا تماشا دیکھتا ہے۔''

راجو کو مالک کی یہ حرکت انتہائی ناگوار گزری۔ وہ درد اور ذلت کے تلخ احساس سے کانپ اٹھا۔ ہاتھوں سے پیالی چھوٹ کر زمین پر گر پڑی۔ آنکھوں سے آنسو کے قطرے چھلک پڑے جو ناکام تمناؤں کا عکس لیے گالوں پر پھیل گئے۔ وہ روہانسا ہو گیا۔ اس کا دل چاہا کہ وہ خوب روئے۔ اس کے دل میں لمحہ بھر کے لیے ہی سہی مگر مالک سے نفرت کا احساس پیدا ہوا۔ گو کہ یہ احساس جلد ہی حالات اور کم عمری کی برف کے تلے دب کر رہ گیا۔

راجو نے میدان کی طرف سے اپنا رخ پھیر لیا اور لاچار و بے بس ہو کر جوٹھے برتنوں کو دھونے میں مشغول ہو گیا۔ شام ہو چکی تھی۔ سرد ہوائیں بہہ رہی تھیں۔ کھلا آسمان اُوس برسا رہا تھا۔ ٹھنڈا پانی ہاتھوں کو کاٹ رہا تھا۔ کئی ادھ ننگے، سوکھے، بدحال، میلے کچیلے بچے، ہوٹل کے سامنے کوڑے کے ڈھیر پر سے پھینکی گئی جوٹھن سے کھانے کی اشیا چن کر کھا رہے تھے۔

دھند میں جزیرہ

برسوں پہلے کی بات ہے۔اب وقت کی ایک وسیع خلیج درمیان میں حائل ہوگئی ہے۔ پورا واقعہ دھندلا دھندلا نظر آرہا ہے۔ایسا لگتا ہے کہ میلوں دور سے چیزوں کو دیکھ رہا ہوں۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب میرے خالو جان ملازمت کے سلسلے میں بوکارو میں مقیم تھے۔ خالہ امی بچوں کے ساتھ وہاں جارہی تھیں۔ میں اُنھیں بوکاروتک چھوڑنے گیا تھا۔ بیرونی جنکشن پرکس ٹرین میں سوار ہوا تھا اور اس وقت اور کون لوگ ساتھ تھے۔ وہ اب پوری طرح ذہن میں محفوظ نہیں ہے۔ ہاں چھوٹے بھائی کے ساتھ پیش آنے والا ایک واقعہ ذہن میں محفوظ رہ گیا ہے۔جس سے واضح ہوتا ہے کہ وہ اس سفر میں ہم لوگوں کے ساتھ تھا۔

صبح کے وقت ٹرین آسنسول پہنچی تھی۔ برسات کی دھلی دھلی صبح، ڈھیر سارے رکشے اور ٹین کے شیڈ والی دکانیں۔ان کے علاوہ وہاں کا کوئی اور منظر یاد نہیں آرہا ہے اسٹیشن پر خالو جان موجود تھے۔ باہران کی کار کھڑی تھی۔کار سے ہم لوگ بوکارو پہنچے تھے۔ میں بوکارو میں کتنے دن رکا اور وہاں میں نے کیا کیا دیکھا۔اس وقت یادنہیں۔ ہاں! اتنا ضرور یاد ہے کہ ہمیں ایک بار بوکارو اسٹیل سیٹی پارک کی سیر کو لے جایا گیا تھا۔ وہاں بچوں کی ریل گاڑی کو میں نے بڑی دلچسپی سے دیکھا تھا۔ دائرہ بناتی ہوئی ریل کی پٹریاں تھیں۔کل تین پڑاؤ تھے۔چھوٹے چھوٹے اور بالکل علامتی: نئی دہلی، کابل اور تاشقند، ہمارے ملک کی اس وقت کی خارجہ پالیسی کے تحت دوستی کی تثلیث، یہ ہند سوویت دوستی کی ایک علامت تھی، جو سقوط ماسکو کے بعد تاریخ کا حصہ بن گئی۔ایک بار بوکارو کے چاس بازار بھی گیا تھا۔میرا چھوٹا بھائی بھی ساتھ تھا۔ہم دونوں نے ایک ہی طرح کے کپڑے پہن

رکھے تھے اور بازار میں ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ کپڑوں کے رنگ مجھے یاد ہیں۔ ہم دونوں بھائیوں کی شکل میں اس وقت تک بہت مشابہت تھی۔ نوخیزی کا زمانہ تھا۔ وقت کی گرد اور حالات کی دھوپ اس وقت تک ہمارے چہروں پر نہیں پڑی تھی۔ شاید دونوں بھائی پرکشش بھی لگ رہے ہوں۔ ایک دکاندار نے پاس بلا کر محبت سے پوچھا تھا۔

''تم دونوں بھائی بھائی ہو؟''

''ہاں'' کہہ کر ہم لوگ آگے بڑھ گئے تھے۔

بوکارو سے میں بذریعہ بس درگاپور آیا تھا۔ بھائی کے سلسلے میں یاد نہیں کہ وہ کب اور کس طرح بوکارو سے گھر واپس آیا۔ درگاپور میں مجھے ایک رشتے کے ماموں سے ملنا تھا۔ ان کا نام تو سید جعفر عباس تھا، لیکن شاید اس لیے کہ وہ جدید خیال کے تھے اور رہن سہن میں جدید فیشن کے دلدادہ تھے، ہم لوگ انھیں صاحب ماموں کہا کرتے تھے۔ وہ ہمارے خاندان کے پہلے گریجویٹ اور پہلے روشن خیال فرد تھے۔

طالب علمی کے دنوں میں جب وہ گھر پر ہوا کرتے تھے تو گرمی کی چاندراتوں میں چھت کی منڈیر پر بیٹھ کر اس وقت کے مقبول فلمی گانے گایا کرتے تھے۔ ان کی آواز میں درد اور یاس کی چمک تھی اور ان کا لحن بھی قابل رشک تھا۔ لیکن ان کے اس شوق کا لوگوں کا ملا جلا ردعمل ہوتا تھا۔ روایت کے کچھ پاس دار بزرگ بھنویں چڑھایا کرتے تھے، تو باقی لوگ ان کی طرفگی اور نغمگی سے دل بہلایا کرتے تھے۔ وہ بڑے خوش مزاج بھی ہوئے تھے۔ ظرافت تو گویا ان کی گھٹی میں پڑی تھی۔ درگاپور میں وہ بائیں بازو کی ٹریڈ یونین سے وابستہ تھے۔ لیکن بعد کے دنوں میں ان کی دلچسپی ان باتوں میں نہیں رہی تھی اور وہ باضابطہ طور پر صوم وصلوٰۃ کے بھی پابند ہو گئے تھے۔ صاحب ماموں میرے آئیڈیل لوگوں میں ایک تھے۔ شاید یہ خود میری آزادہ روی اور غیر مذہبی خیالات کی وجہ سے

تھا۔ اس کے علاوہ ان سے اُنس کا اور بھی کوئی سبب رہا ہوگا۔ لیکن وہ اس وقت میرے ذہن میں بہت نمایاں نہیں تھا۔ بس میں خود کو ان سے منسلک رکھنا چاہتا تھا۔

درگاپور پہنچتے ہی جو آواز سب سے قبل میرے کانوں میں پڑی تھی۔ وہ کوئی بنگالی گیت تھا، جو کہیں بجایا جارہا تھا۔ بنگالی زبان و ادب کے وقار اور بنگال کے سانولے حسن کے متعلق میری معلومات اس وقت ناکافی تھیں۔ پھر بھی وہ گیت اپنی غنائیت اور زور کی وجہ سے مجھے بہت پسند آیا تھا۔ اگر چہ میں اُس کے معنی سمجھ نہ سکا تھا۔ بنگال کی سرزمین پر قدم رکھنے پر وہ پہلا تجربہ مجھے اور باتوں کی بہ نسبت بہتر طور پر یاد ہے۔ درگاپور کے بنی چٹی بازار میں میرے مولد و مسکن کے ایک صاحب عرفان نامی کی بیکری تھی۔ پہلے میں ان کے پاس گیا تھا اور ان سے پتہ حاصل کر کے صاحب ماموں تک پہنچا تھا۔ وہ اسٹیل پلانٹ کے ٹاؤن شپ میں رہا کرتے تھے۔ میں درگاپور میں ایک دن رہا ہوں گا۔ وہاں کیا باتیں ہوئی تھیں، کیا مصروفیتیں رہی تھیں، یہ سب یاد نہیں۔ بس اتنا یاد ہے کہ صاحب ماموں کے ساتھ اسکوٹر پر سوار ہو کر میں درگاپور ٹاؤن شپ میں گھوما تھا۔ وہاں کے اسکولوں، اسپتال اور دفاتر کو دیکھا تھا۔ اس وقت تک درگاپور ٹاؤن شپ خاصا عمر رسیدہ ہو چکا تھا۔ سڑکوں کے اشجار تناور اور سایہ دار ہو چکے تھے۔ اب اس وقت یہ یاد بھی تازہ ہو رہی ہے کہ میں جب درگاپور سے گھر واپس ہو رہا تھا تو صاحب ماموں اور دیگر افراد خانہ مجھے اسٹیشن تک چھوڑنے آئے تھے۔ لیکن میں کچھ غمگین تھا کہ نہیں، اس باب میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔

صاحب ماموں سے میری آخری ملاقات اس سفر کے برسوں بعد چھوٹے بھائی کی شادی کے موقعے پر ہوئی۔ وہ بہت نحیف ہو چکے تھے۔ ان کی خوش طبعی سب زائل ہو چکی تھی۔ وہ عزلت پسند اور خاموش طبع ہو چکے تھے۔ میں بس میں ان کی بغل والی سیٹ پر بیٹھا تھا، لیکن انھوں نے مجھ سے زیادہ بات چیت نہیں کی تھی۔ شادی کے کچھ دن بعد ہی ایک دن وہ سدا کے لیے خاموش ہو گئے

تھے۔اس روز وہ دفتر سے آئے تو ان کی طبیعت ناساز تھی۔انھیں سینے میں درد محسوس ہو رہا تھا۔گھر کے افراد انھیں اسپتال لے گئے ۔ جہاں ڈاکٹر نے انھیں خصوصی نگہداشت میں داخل کر لیا اور عزیز و اقارب کو کمرے کے باہر ہی رکھا۔کسی کو پتہ نہیں لگ رہا تھا کہ ان کے ساتھ کیا ہو رہا ہے اور ان پر کیا گزر رہی ہے ۔ دیر تک سب لوگ تشویش میں مبتلا رہے۔اچانک ڈاکٹر منھ لٹکائے کمرے سے باہر نکلا۔اس کا منھ دیکھتے ہی سب لوگ بے اختیار رونے لگے تھے۔ پورا ماحول آہ و بکا میں ڈوب گیا تھا۔والد صاحب اور صاحب ماموں کے درمیان بڑی قربت تھی ۔ دونوں میں پابندی کے ساتھ خط و کتابت ہوتی تھی ۔ان کی موت پر ابا نے کیسا محسوس کیا تھا؟ کیا وہ روئے بھی تھے؟ اور وہ کتنے دنوں تک درد و غم میں مبتلا رہے تھے۔کاش کہ آج اس وقت مجھے یہ باتیں ٹھیک سے یاد آ جاتیں۔ یہ ستم ظریفی کیا کم ہے کہ خاندان کے دیگر مرحومین تو آم کے پیڑوں کے نیچے اپنے آبائی قبرستان میں آرام فرما ہیں اور صاحب ماموں سیکڑوں میل دور درگا پور کے کسی نامانوس شہر خموشاں میں پیوند زمین ہیں۔

صاحب ماموں کے انتقال کے تھوڑے ہی دنوں بعد میں ایک بار پھر ان کی آنکھوں کے روبرو ہوا تھا۔ یہ کوئی خواب نہیں، بلکہ ایک سہانے دن کا واقعہ تھا۔ ہمارے گھر میں کوئی تقریب تھی ۔شرکت کے لیے بہت سارے رشتے دار آئے ہوئے تھے۔ میری آمد بھی ایک عرصہ بعد ہوئی تھی ۔ میں جب گھر کے اندر داخل ہوا، تو ایک خاتون نے مجھے سلام کیا۔ میں نے انھیں یوں ہی جواب دے دیا اور پھر باہر چلا آیا۔تھوڑی دیر کے بعد جب پھر کسی کام کے سلسلے سے اندر گیا تو دیکھا کہ میری چھوٹی بہن اُسی خاتون کی بغل میں بیٹھی ہوئی انھیں بڑی اپنائیت سے دیکھ رہی ہے۔

’’بھائی جان! آپ نے ان کو پہچانا؟‘‘

’’نہیں، میں نے تو نہیں پہچانا۔‘‘ میں نے کچھ محجوب ہو کر جواب دیا۔

''غور سے دیکھیے، پہچان لیجیے گا۔'' بہن نے اصرار کیا۔

میری بہن کی بات پر وہ محترمہ مسکرائیں۔ ان کو مسکراتا دیکھ کر اچانک بہت سارے قمقمے میرے ذہن میں جل اُٹھے۔ میری آنکھوں میں ایک چہرہ اُبھرا اس میں دو آنکھیں روشن ہوئیں۔ ان آنکھوں میں ایک مسکراہٹ تیر گئی۔ قوس قزح جیسی روشن اور رنگین مسکراہٹ دیکھ کر مجھے معاً خیال آیا۔ ارے! یہ آنکھیں تو صاحب ماموں کی ہیں۔ میں مسرت سے کھل اُٹھا۔ پھر میں بہن سے مخاطب ہوا۔

''یہ تو رشیدہ ہیں، صاحب ماموں کی بیٹی!''

دونوں ہنسنے لگیں۔ اب مجھے بہت کچھ یاد آیا۔ رشیدہ مجھ سے کچھ ہی چھوٹی تھی۔ وہ درگا پور سے آتی تو ہم لوگوں سے ذرا دور دور رہا کرتی تھی۔ بس آنے جانے کے موقعے پر سلام کلام کے دوران ہم لوگ اس کی صورت دیکھ لیا کرتے تھے۔ حالانکہ اس سے ملنے اور اس سے باتیں کرنے کی جستجو ہمیشہ ہمارے دلوں میں تڑپا کرتی تھی۔ لیکن پتہ نہیں کیوں؟ اسے خاندان کے افراد اور گاؤں کے مکینوں سے الگ تھلگ رکھا جاتا تھا۔ ایک آنگن میں رہتے ہوئے یہ فاصلہ کیوں تھا؟ شاید اس لیے کہ ہم لوگ گاؤں کے پس ماندہ لوگ تھے اور اس کی پرورش و پرداخت شہر میں جدید انداز سے ہو رہی تھی۔

خیر اس وقت ان باتوں کو یاد کرنا عبث تھا۔ رشیدہ سے بہت ساری باتیں ہوئیں۔ اس نے شکایت کے لہجے میں کہا کہ آپ سے بہت دنوں کے بعد ملاقات ہو رہی ہے۔ اس ایک بار کے بعد آپ پھر کبھی درگا پور نہیں آئے اور سنا ہے کہ آپ نے گھر آنا بھی کم کر دیا ہے۔ میں نے اس کی باتوں کا کوئی جواب نہ دیا اور اس کی مسکراہٹ اور اس کے انداز گفتگو میں اس کے والد مرحوم کا عکس ڈھونڈتا رہا۔

درگا پور سے جب میں واپس ہو رہا تھا تو ٹرین غالباً رات کی تھی۔ ٹرین میں بھیڑ کتنی تھی، ہم سفر کس طرح کے لوگ تھے، کس طرح اور کس وقت میں برونی پہنچا تھا، اس کی تفصیل اس وقت ذہن

میں نہیں ہے۔ میرا ذہن خالی خالی، بے منظر اور خدا جانے کیوں اداس اداس معلوم ہو رہا ہے۔ زندگی کے دریا میں ڈھیر سارا پانی بہہ چکا ہے۔ جو کچھ زیب داستاں ہے، اسے بڑی مشکل سے گہری دھند میں ڈوبے ہوئے یادوں کے جزیرے سے نکال کر لایا ہوں، مگر یہ تو ہوتا ہی رہتا ہے۔ اس میں رنج کی کیا بات ہے؟

دل کے مقتل میں

ان دنوں میں یونی ورسٹی میں ریسرچ اسکالر تھا۔میرے ریسرچ کا موضوع کوسی ندی کے آس پاس کی آبادی کے سماجی واقتصادی حالات کا جائزہ لینا تھا۔اس کام کے لیے جب میں نے اس علاقے کا پہلا سفر کیا تو وہاں کے فطری مناظر نے مجھے بہت متاثر کیا تھا۔کوسی ندی کی دوردور تک پھیلی ہوئی شاخیں،اس کا چمکتا ہوا صاف پانی اور ندی کے اوپر بنے ریل کے پلوں کا سلسلہ۔ٹرین جب پل پر سے گزرتی تو ایک دل فریب موسیقی کے آہنگ کا احساس ہوتا۔چاروں طرف ہریالی ،دھان کے کھیتوں اور گھاس کے میدانوں کی شادابی اور کھیتوں میں کام کرتی ہوئی گاؤں کی حسینائیں۔

میں کئی مہینے اس علاقے میں رہا تھا۔میرا قیام نزدیک کے شہر سہرسہ میں تھا۔وہاں سے میں روزانہ کوسی ندی کے کنارے آباد بستیوں میں چلا جاتا اور وہاں دن بھر لوگوں کے سماجی واقتصادی حالات کا مطالعہ کرتا اور واپس آکر رات میں اپنے نوٹس تیار کرتا۔اس طرح وقت گزرتا گیا اور میرے ریسرچ کا کام آگے بڑھتا رہا۔یہاں تک کہ بھاگتے مہینوں اور عشروں کے دوش پر برسات آگئی۔اس سال خوب بارش ہوئی تھی جس سے کوسی ندی میں سیلاب آگیا تھا۔بہت ہی بھیانک سیلاب۔پانی چاروں طرف پھیل گیا تھا اور دیکھتے ہی دیکھتے پورا علاقہ غرقاب ہوگیا تھا۔ہری گھاس کے میدان ڈوب گئے تھے۔دھان کے تمام کھیت زیرآب ہوگئے تھے اور پانی بستیوں میں داخل ہونے لگا تھا۔

میں سیلاب کے ایسے ہی مشکل دنوں میں ایک روز شہر سے دور ایک دیہی علاقے میں گیا ہوا

تھا۔اس روز موسم بھی خاصہ خراب ہوگیا تھا۔آسمان ابر آلود تھا۔ہوا تیز چل رہی تھی۔پچھلے پہر ہلکی بارش بھی ہونے لگی تھی۔جب میں نے شہر جانے کے لیے نزدیک کے ریلوے اسٹیشن تک پہنچنا چاہا تو تمام راستے پانی کے زور سے بند ہو چکے تھے۔کسی بھی راستے کو بغیر کشتی کے پار کرنا ممکن نہیں تھا اور افسوس یہ کہ وہاں ایک بھی کشتی موجود نہیں تھی۔میں دیر تک اس ادھیڑ بن میں رہا کہ اب کیا کروں؟ گھڑی کے کانٹے بڑی تیزی سے آگے بڑھ رہے تھے۔دن ڈھلنے لگا تھا اور شام اپنی گود میں اندھیروں کو لیے قریب آرہی تھی۔بارش بھی تیز ہو چکی تھی۔

جب مجھے کوئی صورت نظر نہیں آئی تو دھان کے کیچڑ بھرے کھیت کا ایک لمبا فاصلہ طے کر کے میں نزدیک کے ایک گاؤں پہنچ گیا۔اس وقت شام کالی ہو چکی تھی اور ہر جانب اندھیرا پھیل چکا تھا۔گاؤں کے شروع ہی میں مٹی کا بنا ہوا ایک گھر تھا۔جس کی کھڑکی سے چراغ کی ایک مدھم روشنی باہر آرہی تھی۔میں نے دروازے پر دستک دی۔دستک کی آواز سن کر ایک بوڑھا آدمی باہر آیا۔میں نے اسے اپنی مصیبت سنائی اور گزارش کی کہ مجھے رات گزارنے کے لیے جگہ دے دیں اس نے چند لمحوں تک مجھے غور سے دیکھا اور تب اندر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''اندر آجاؤ۔''

اس بوڑھے آدمی نے مجھے اپنے کمرے میں رکھ لیا۔میں نے رات بہت آرام سے گزاری۔سویرے نیند کچھ دیر سے ٹوٹی اور آنکھوں میں غنودگی باقی تھی کہ گھاس کی گٹھڑی لیے ایک لڑکی سامنے سے گزری۔اس کا سانولا چہرہ چمکا۔برسات کے سیاہ بادلوں جیسے بال لہرائے اور پر کشش آنکھیں جھانکنے لگیں۔میری ساری غنودگی لمحہ بھر میں کافور ہوگئی۔مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں۔یہ بھی حسن اتفاق تھا کہ میں اس روز اس لڑکی کے یہاں مہمان ہوا تھا جو ایک بار فقط چند منٹوں کے لیے سفر میں میرے ساتھ ہوئی تھی اور جس کے وجود کی کشش میں نے بہت

دنوں تک محسوس کی تھی۔ میں جب پہلی بار ریسرچ کے سلسلے میں سہرسہ جارہا تھا تو راستے میں یہی لڑکی اپنی ماں کے ساتھ میرے ڈبے میں داخل ہوئی تھی۔ اس دیہاتی لڑکی کی آنکھیں اور کالے بال بہت خوب صورت تھے۔ میری نگاہیں اس کے چہرے پر مرکوز ہوگئی تھیں اور اس وقت میں نے چاہا تھا کہ کاش! وہ لڑکی دور تک میری ہم سفر بنی رہے۔ لیکن افسوس کہ وہ اگلے اسٹیشن ہی پر اتر گئی تھی۔

اس واقعے کے بعد جب بھی میں اس راستے سے گزرتا، میرا ذہن یادوں کی وادی میں بھٹک جاتا۔ میرا شعور سپنوں کی قوس قزح بنانے لگتا۔ میرا دل گاڑی کھلنے تک بے جا طور پر منتظر رہتا کہ شاید وہ سانولی شام پھر شریک سفر ہو جائے۔ لیکن گاڑی کھل جاتی اور وہ کبھی نہیں آتی۔ اب میں اس لڑکی کو اتنا نزدیک پا کر بہت مسرور ہوا تھا میرے خیالوں کے آسمان میں جیسے چاند روشن ہو گیا تھا اور ستارے جگمگانے لگے تھے۔ میں دیر تک اس کو دیکھتا رہا تھا۔ وہ لڑکی گھاس کی گٹھڑی لیے اندر چلی گئی تھی۔ اسے شاید معلوم تھا کہ میں ایک پردیسی ہوں اور سیلاب کی وجہ سے اس کا مہمان بن گیا ہوں۔ کچھ دیر بعد اس لڑکی نے میرے لیے ناشتہ لایا۔ ناشتہ کرتے ہوئے میں نے اس سے دریافت کیا...... تمہارا نام کیا ہے؟ ایک جل ترنگ سا بج گیا، جب اس نے جواب دیا۔ ''میرا نام نیلما ہے۔'' میں نے اس سے اپنے سفر کا ذکر کیا، جب میں نے اسے پہلی بار دیکھا تھا۔ نیلما میری باتیں سن کر مسکرانے لگی۔ میں اس کے لبوں کے پھول چن کر اپنے وجود کے دامن کو سجاتا رہا۔ ناشتے کے بعد مجھے اپنے میزبان کو الوداع کہہ کر رخصت ہو جانا چاہیے تھا لیکن بڑھتے ہوئے سیلاب کی وجہ سے بوڑھے میزبان نے مجھے روک لیا۔ اس نے کہا۔ ''بابو جی اس گاؤں کے چاروں طرف پانی پھیل چکا ہے اور سیلاب کا زور بڑھتا ہی جارہا ہے ایسی حالت میں آپ کہاں جائیں گے؟ جبکہ آپ یہاں کے لیے اجنبی بھی ہیں۔'' میں انکار نہیں کر سکا اور کئی دنوں تک نیلما کے

یہاں رہ گیا۔

میں برآمدے میں بیٹھا کتابیں پڑھتا رہتا۔ نیلما گھاس لاتی۔ اسے کاٹتی اور مویشیوں کو کھلاتی۔ کام کرتے ہوئے اس کا حسن اور بھی نکھر جاتا۔ محنت کی کلیاں اس کے رخساروں کو دلفریب بنا دیتیں۔ اس کا صحت مند جسم پسینے سے شرابور ہو جاتا اور چہرے پر موتیوں کی لڑی سی بن جاتی۔ میں محبت بھری نگاہوں سے اسے دیکھتا رہتا۔ ایک روز اس نے مجھ سے پوچھا۔ ''آپ کیا کرتے ہیں؟'' نیلما میرا تفصیلی جواب شاید نہ سمجھ سکتی تھی۔ اس لیے میں نے اسے مختصراً کہا۔ ''میں تم لوگوں کی مالی حالت اور رہن سہن وغیرہ کا حال معلوم کرنے آیا ہوں۔'' اس نے پھر پوچھا۔ ''آپ نے یہاں کیا پایا؟'' مجھے بہت خوشی ہوئی تھی کہ نیلما نے میرے کاموں میں دلچسپی لی تھی۔ میں نے جواب دیا۔ ''غریبی اور پس ماندگی۔''

نیلما اپنے کاموں میں لگی رہی۔ پتہ نہیں اس نے میری باتوں کو سمجھا یا نہیں۔ اُسی وقت ہوا کا ایک جھونکا آیا اور نیلما کے گیسو بکھر گئے۔ میں نے اس کے بالوں کو ٹھیک کر دیا۔ مجھے اپنے اتنا قریب پا کر وہ شرما گئی۔ اس نے اپنی نگاہیں جھکا لیں۔ اس کے چہرے پر سرخی آ گئی تھی۔ دونوں خاموش ہو گئے تھے۔ کچھ دیر بعد میں نے سکوت توڑا۔ ''نیلما! تم بہت پیاری ہو۔'' تمہارے ساتھ زندگی بہت حسین گزرے گی۔'' کچھ دیر رک کر میں نے پھر کہا۔ ''نیلما تم کوسی کی شہزادی ہو۔'' یہ کہہ کر میں نے نیلما کی طرف دیکھا اور اس کے گرد سپنوں کا شیش محل تعمیر کرنے لگا۔ روشن چاند اور جگمگاتے ستاروں کا آسمان بنانے لگا۔ لیکن مجھے فوراً احساس ہوا کہ ہمارے خواب تو برسات کی دھوپ ہیں۔ جب میں نے اپنے حالات کا جائزہ لیا تو ذہن میں کانٹے چبھنے لگے۔ میرا وجود دھند میں ڈھک گیا اور تلخ حقائق کے سنگ ریزوں نے میرے پیروں کو لہولہان کر دیا۔ مجھے خوابوں کی حسین وادی سے لوٹ آنا پڑا۔ میرے ارمانوں کی دھنک کے رنگ غائب ہو چکے تھے۔ نیلما بھی اُداس اور خاموش تھی۔

خوشیوں کا وقت عارضی تھا جو بہت جلد گزر گیا۔ چند دنوں کی رفاقت ہی سہی۔ لیکن نیلما کے ساتھ بہت اچھا وقت گزر رہا تھا۔ ہم دونوں نے چاہا تھا کہ وقت کو قید کر لیں۔ مگر عصر حاضر کا عذاب، معاش کی الجھنیں اور زندگی کے تلخ حقائق نے میرے پیروں میں بیڑیاں ڈال دی تھیں اور میں وقت کو قید نہ کر سکا تھا۔ دھیرے دھیرے سیلاب کا زور گھٹنے لگا۔ اس علاقے میں میرا کام بھی اب تکمیل کے مرحلے میں تھا۔ میں نے اپنے میزبان سے اجازت لی اور وہاں سے رخصت ہوا۔ اس وقت نیلما دروازے پر کھڑی تھی۔ اس کا چہرہ اُداس تھا۔ اس کی آنکھیں نم تھیں اور رخسار بھیگے ہوئے تھے۔ میرے دل کا درد بھی بڑھ گیا تھا۔ میں نے اُداس نگاہوں سے اسے دیکھا اور بوجھل قدموں کے ساتھ ریلوے اسٹیشن کی طرف بڑھنے لگا۔

میں ریلوے اسٹیشن پہنچا۔ کچھ دیر میں ٹرین آ گئی۔ میں گاڑی میں سوار ہو گیا۔ چند لمحوں بعد گاڑی کھل گئی۔ ہر لمحہ آگے بڑھتی ہوئی گاڑی مجھے نیلما سے دور کرتی جا رہی تھی۔ زندگی کی ہزاروں خواہشوں کی طرح، نیلما کی چاہت بھی، دل کے مقتل میں صلیب کا حسن بن گئی تھی۔ لیکن کیا وہ یادیں بھی قتل ہو گئیں؟ زندگی کی ہزاروں دھوپ چھاؤں کے باوجود وہ یادیں اب بھی تر و تازہ ہیں۔ کوسی ندی کا صاف شفاف پانی، دھان کے کھیتوں کی ہریالی اور نیلما کا سانولا چہرہ اکثر ذہن کے پردے میں خوابوں کی طرح آتا رہا ہے، جاتا رہا ہے۔

کانٹا

میری یادوں کے آئینہ خانے میں جو تصویریں برسوں سے محفوظ ہیں۔ان میں رامودا کی تصویر بھی ہے جو اکثر آئینہ خانے سے نکل کر ذہن کے پردے پر ابھر آتی ہے اور مجھے مضطرب کر دیتی ہے۔میرے جذبات کی پرسکوں سطح پر ایک طغیانی سی پیدا ہوتی ہے۔موجوں کا اضطراب مجھے اپنے ساتھ بہالے جاتا ہے اور میں نہ چاہتے ہوئے بھی یاد ماضی میں گم ہو جاتا ہوں۔

برسوں پرانی بات ہے۔میں ان دنوں اپنے ریسرچ کے کاموں میں مصروف تھا۔یوں ریسرچ تو مجھے قبل ہی کر لینا چاہیے تھا لیکن دیگر مصروفیتوں نے مجھے اس کام کو انجام دینے کا موقع فراہم نہیں کیا۔ہاں ملازمت میں پروموشن کے مسئلے نے جب کچھ مشکل صورت اختیار کر لی تو مجھے ریسرچ کا آغاز کرنا پڑا۔میرے ریسرچ ورک میں فیلڈ ورک شامل تھا اور اس کے لیے مجھے بہت ساری جگہوں میں جانے کا اتفاق ہوا۔ میرا موضوع مونگیر کمشنری کے خاروخس کا شناسیاتی مطالعہ (Taxonomic Study) تھا۔میں نے خاروخس کے مطالعے کا موضوع شعوری طور پر منتخب کیا تھا۔اس موضوع میں مجھے خاصی دلچسپی نظر آتی تھی۔یہ پودے حالانکہ ناپسندیدہ مانے جاتے تھے پھر بھی ان میں بہتوں کی خصوصی اقتصادی اہمیت پوشیدہ تھی۔کوئی دوا کے کام آتا تھا۔کوئی جانوروں کی غذا کے لیے مخصوص تھا۔کسی سے زمینوں کی گھیرابندی کا کام لیا جاتا تھا۔پھر بھی ان پودوں کو لوگ نظر انداز کر دیتے تھے اور انھیں حقیر نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ان پودوں کو دیکھ کر مجھے اس وقت اپنے گاؤں کے غریب مزدور اور پس ماندہ لوگ یاد آ جایا کرتے تھے،جنھیں اکثر ہمارے گاؤں کے نام نہاد شرفا اپنے حلقے سے خارج رکھتے تھے۔انھیں ہمیشہ حاشیے پر رکھا جاتا تھا۔ان marginals کو

کبھی معاشرے میں مناسب جگہ نہیں دی جاتی تھی۔گاؤں میں زمین کے بڑے مالکان یا زمیندارانہ باقیات کے لوگ تو چند ہی تھے۔باقی لوگ غریب اور متوسط طبقے کے تھے،لیکن عجیب بات تھی کہ ان میں زیادہ تر ان زمینداروں ہی کے طفیلی بنے ہوئے تھے۔ہمارے بچپن کے زمانے میں اگر کوئی جاگیردارانہ نظام یا اس کی باقیات کے خلاف کچھ بولتا تو لوگ اسے مذہب کی مخالفت کے مساوی مانتے تھے۔اب یہ اچھا ہوا یا برا،مگر ہوا یہ ضرور کہ تغیرات زمانہ کے ہاتھوں،حویلیوں کے دروازے پر لٹکنے والا پردہ رفتہ رفتہ بوسیدہ ہو کر تار تار ہو گیا اور ان عمارتوں میں روزانہ پانی بھرنے والی عورتوں کا نصیبہ جاگا اور انھیں آسودگی حاصل ہوئی۔انھیں گھر بیٹھ کر دو وقتوں کی روٹی کھانے کا سکون حاصل ہوا۔اب یہ اور بھی اچھا ہوتا کہ حویلیوں کا استحکام بھی باقی رہ جاتا لیکن طبقاتی معاشرے میں پرانے طبقے کے بطن ہی سے نیا طبقہ وجود میں آتا ہے۔

موضوع کے انتخاب کے وقت Weed Flora مجھے بہت راس آیا۔اس کام کو انجام دینے کے لیے مجھے خوب گھومنے پھرنے کا موقع ملا۔افتادہ زمینوں ،ریل کی پٹریوں ،سڑکوں اور ندیوں کے کنارے، باغ باغیچے ،مختلف فصلوں اور بہت سارے آبی مقامات کے پاس جانے کا اتفاق ہوا۔ مجھے ہر خار و خس سے مل کر احساس ہوتا تھا کہ کہیں میں خود سے تو نہیں مل رہا ہوں۔ میں ان کے چہرے میں جھانک کر دیکھتا۔اُف خدا! ہو بہو وہی آنکھیں،وہی ناک نقشہ۔یہ پودے اگر انسان ہوتے تو میرے بچپن کے دنوں کی طرح،ان کے جسم پر بھی بوسیدہ کپڑے ہوتے اور ان کے پیروں میں معمولی سے چپل۔میں اکثر ان پودوں کے سرخ، نیلے پیلے،سبز اور سفید پھولوں کو چوم لیتا۔

اس تحقیق اور نئے نئے Weed کی تلاش میں ،میں نے ایک بار ایک جھیل کا دورہ کیا۔جو ہندوستان کا ایک مشہور آبی مقام ہے ۔یہ ہمارے ضلعے کے صدر مقام کے شمال میں تقریباً بیس پچیس کیلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔اس جھیل کے درمیان میں ایک اونچی جگہ ہے۔اس پر ایک

قدیم مندر اور ایک ڈاک بنگلہ بنا ہوا ہے اور اس اونچے مقام کے چاروں طرف پانی کا ایک لامحدود ذخیرہ ہے۔ اس کے کنارے کنارے کھیتوں کا سلسلہ ہے جس میں دھان کی کاشت ہوتی ہے۔ مجھے وہاں جانے کے بعد احساس ہوا کہ یہ جھیل پودوں کے لیے زیادہ اہم نہیں ہے۔ مجھے وہاں زیادہ تر وہی پودے ملے جو قبل سے میرے آشنا تھے اور عام آبی مقامات میں بھی پائے جاتے تھے۔ ہاں وہ جگہ مہاجر پرندوں (Migratory Birds) کے لیے بہت اہم ہے کہ وہاں ہر سال جاڑے میں سائبیریائی پرندے جھنڈ کے جھنڈ آتے ہیں۔ اس وقت سائبیریا برف میں تبدیل ہو چکا ہوتا ہے۔ لہٰذا وہاں کے پرندے ہندوستان کے قدرے معتدل سرد مقامات میں چلے آتے ہیں۔ یہاں اس وقت دھان کے خوشوں میں پرورش پانے والے دانوں کا دودھیا ذائقہ انہیں ہندوستان کی میزبانی کا لطف دیتا ہے۔ وولگا سے گنگا تک کے اپنے سفر کو یہ پرندے ایک خوب صورت تجربہ شمار کرتے ہوں گے۔

میں اس روز جھیل کے مقام پر دن بھر رہا۔ کنارے کنارے گھوم کر اپنی ضرورت کے مطابق پودوں کو یکجا کیا۔ ڈاک بنگلے کے برآمدے میں بیٹھ کر مندر کے احاطے میں اچھل کود کرتے بندروں اور پانی اور دھان کے کھیتوں میں پرواز کرتے مہمان پرندوں کی رعنائیوں سے دیر تک لطف اندوز ہوتا رہا۔ اس طرح دن بیت گیا اور شام دستک دینے لگی۔ میں نے یکجا کیے گئے پودوں کو سمیٹا اور واپسی کے سفر کے لیے تیار ہوا۔ اسی وقت مجھے یاد آیا کہ جھیل کے نزدیک ہی کے گاؤں میں میرے یونی ورسٹی کے دنوں کے ساتھی کا گھر ہے۔ اشوک ان دنوں میرا گہرا دوست تھا۔ یونی ورسٹی کی تعلیم حاصل کرنے کے زمانے میں اکثر و بیشتر ہم لوگ ساتھ رہا کرتے تھے۔ زندگی کے رازوں میں ایک دوسرے کو شریک کرتے۔ وہ اس وقت بھی آزاد طبیعت کا مالک اور زندگی کے ایک خاص مقصد کا حامل تھا۔ اس نے زندگی کو مڑ مڑ کر نہ دیکھا بلکہ تعلیم حاصل کرنے کے بعد، سماجی کاموں میں مصروف ہو گیا اور اس وقت اپنی مختصر سی کاشت پر انحصار کر کے، گاؤں کے کسانوں مزدوروں کے مسائل پر کام

کرنے لگا تھا۔ میں نے سوچا کہ یہ بہتر موقع ہے۔ کیوں نہ میں اس سے اس وقت مل لوں۔

میں اشوک کے گاؤں کی طرف روانہ ہوا، وہ اس وقت گھر ہی میں تھا۔ وہ خندہ پیشانی سے مجھ سے ملا۔ میرا ارادہ اسی وقت واپس ہو جانے کا تھا لیکن اس نے شب گزاری کے لیے اصرار کیا جسے میں ٹال نہ سکا۔ اس نے مجھے اپنے گاؤں کی سیر کرائی۔ مجھے اپنے دوستوں سے ملایا۔ اپنے گاؤں کے باشندوں سے روشناس کرایا۔ رات کا کھانا کھانے کے بعد، میں اشوک اور اس کے دوستوں کے ساتھ باہری دروازے میں بیٹھا ہوا، الاؤ کی گرمی اور آپس کی گفتگو سے محظوظ ہو رہا تھا کہ ایک ضعیف شخص ہمارے درمیان آیا۔ وہ شخص بیمار اور کمزور معلوم ہو رہا تھا۔ اس کی داڑھی سفید ہو چکی تھی۔ سر کے زیادہ تر بال جھڑ چکے تھے۔ اس کے کپڑے بوسیدہ اور جگہ جگہ سے پھٹے ہوئے تھے۔ اشوک نے میرا اس سے تعارف کرایا۔

''یہ رامودا ہیں۔ ہمارے بھائی لگتے ہیں۔''

میں نے ان کو آداب کیا اور ساتھ بیٹھنے کی گزارش کی۔ رامودا ہمارے درمیان بیٹھ گئے اور ہماری گفتگو کو خاموشی سے سننے لگے۔ اسی دوران میں نے کسی سے دن بھر کی اپنی روداد بیان کی۔ اس روداد میں جھیل کا ذکر آنا تھا کہ رامودا مضطرب ہو گئے۔ ان پر ہیجان طاری ہو گیا اور وہ ہاتھ اٹھا اٹھا کر چلانے لگے۔

کابر (kabar) چلو!

کابر (kabar) چلو!!

کابر (kabar) اس جھیل کا نام تھا جہاں کہ میں اس دن پودوں کے سروے کے لیے گیا ہوا تھا۔ میں حیرت زدہ ہو گیا کہ آخر رامودا kabar lake کا نام سن کر اس قدر مشتعل کیوں ہو گئے تھے۔ اشوک اور وہاں پر موجود لوگ رامودا کی اس حرکت سے حد درجہ شرمندہ تھے۔ ان لوگوں نے

انھیں کسی طرح سمجھا بجھا کر گھر روانہ کر دیا اور مجھ سے اس بدمزدگی کے لیے معذرت خواہ ہوئے۔ میں نے اس واقعے کو سنجیدگی سے نہیں لیا اور اسے نظر انداز کر دیا۔ رات زیادہ ہو چکی تھی۔ لہٰذا میں لوگوں سے اجازت لے کر، سونے کے لیے کمرے میں چلا گیا۔

صبح ہوئی تو ناشتہ وغیرہ سے فارغ ہونے کے بعد میں نے اپنی منزل کے لیے واپسی کا سفر اختیار کیا۔ اشوک مجھے گاؤں کی سرحد تک چھوڑنے آیا۔ میں نے اس کی تشفی بخش میزبانی اور برسوں پرانی رفاقت کی تجدید سے حاصل مسرت اور تازگی کا بار بار ذکر کیا۔ اسی درمیان مجھے رامودا یاد آ گئے۔ میں نے اشوک سے دریافت کیا کہ kabar lake کے ذکر سے رامودا اس قدر مشتعل کیوں ہو گئے تھے؟ اشوک نے رامودا کا قصہ چھیڑ دیا جس کا خلاصہ یہ تھا کہ جب حکومت نے kabar lake کی وسعت کے لیے اس کے اطراف میں موجود کسانوں کی بہت ساری زمینوں کو ہڑپ لیا تو بڑے کسانوں کو حکومت کے اس فیصلے سے کچھ فرق تو محسوس نہ ہوا لیکن چھوٹے کسان، جن میں رامودا بھی شامل تھے۔ ان لوگوں کا بہت نقصان ہوا۔ یہ لوگ بے زمین والے ہو گئے تھے۔ کیونکہ ان لوگوں کے پاس بس اتنی سی ہی زمین تھی۔ سرکار نے انھیں مناسب معاوضہ نہیں دیا اور نہ ہی ان لوگوں کی گزر بسر کی کوئی دوسری فکر کی۔ رامودا اور اس طرح کے دوسرے کسانوں نے حکومت کے اس فیصلے کے خلاف تحریک چلائی۔ اس وقت ان لوگوں کا نعرہ تھا۔

kabar چلو!

Kabar چلو!!

مجھے اس قصے میں دلچسپی کا احساس ہوا۔ میں نے اشوک سے پھر پوچھا۔ رامودا کی تحریک کا انجام کیا ہوا؟

''انجام وہی ہوا۔ جو عام طور پر محنت کشوں کی تحریک کا ہوتا ہے۔ اس تحریک کو انتظامیہ نے کچل

دیا۔'' اشوک نے جواب دیا۔

گاؤں کی سرحد ایک باغ پر ختم ہوتی تھی۔ اس سرسبز باغ میں ہم دونوں دیرینہ رفیق بغل گیر ہوئے اور ایک دوسرے کو الوداع کہا۔ اب یہ واقعہ پرانا ہو چکا ہے۔ مجھے ڈاکٹریٹ کی ڈگری مل چکی ہے۔ اب زندگی کے دوسرے مسائل سامنے ہیں۔ پھر بھی جب کہیں کسی کے ساتھ جبر کا معاملہ سامنے آتا ہے تو رامو دا یاد آ جاتے ہیں۔ ان کا پریشان چہرہ آنکھوں میں پھرنے لگتا ہے۔ میں بے چین ہو جاتا ہوں۔ انسانی کربناکیوں کے مداوا کے لیے کچھ کرنے کی طبیعت کرتی ہے۔ ضمیر کچوکے مارتا ہے۔ لیکن یہ سوچ کر اداس ہو جاتا ہوں کہ ایک نادار شخص جو خود ہی زندگی کے پیچ در پیچ راستے میں کہیں گم ہو چکا ہے، ایسے لوگوں کی طمانیت کا وسیلہ کس طرح بن سکتا ہے۔

ہاں دل میں کانٹا ضرور چبھتا رہتا ہے!

خواب

وہ گلی پورے شہر میں مشہور تھی۔ اس گلی میں کئی مکانات تھے۔ ان مکانوں میں سے ایک دومنزلے مکان میں وہ رہا کرتی تھی۔ اس کا نام رام کلی تھا۔ عمر اس کی پچیس تیس برس کی ہوگی۔ وہ ایک اوسط قد کی گوری، چٹی، صحت مند اور مناسب ناک نقشے کی عورت تھی۔ اس کے دانت چھوٹے اور چمک دار تھے۔ اس کے بال بڑے اور سیاہ تھے۔ اس کے چہرے پر ایک مخصوص قسم کی کشش تھی۔ وہ اکثر سوچا کرتی کہ اگر وہ کچھ دراز قد ہوتی تو یقیناً یہاں کی سب سے خوب صورت عورت مانی جاتی۔ پھر بھی جب وہ فٹ پاتھ پر بجلی کے کھمبوں کے نیچے کھڑی اپنی دوسری ہم پیشہ عورتوں کو دیکھتی تو فخر سے اس کی چھاتیاں تن جاتیں اور وہ آئینے کے سامنے کھڑی ہو کر خود کو داد دینے کے انداز میں تکنے لگتی۔

اس مکان میں ایک بڑھیا بھی رہا کرتی تھی۔ وہ بڑھیا دراصل اس گھر کی مالکن تھی اور اس مکان کے ساتھ رام کلی بھی اس کی ملکیت میں شامل تھی۔ پتہ نہیں رام کلی کا اس سے کیا رشتہ تھا، لیکن وہ اسے موسی کہا کرتی تھی۔ جب کہ لوگ کہتے تھے کہ وہ رام کلی کی کوئی رشتہ دار نہیں ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ جب بڑھیا جوان تھی تو وہ اس گلی کی بہت ہی طرح دار جنس تھی اور اس نے اپنے وقت میں شہر کے رئیسوں اور منچلوں کو اپنا دیوانہ بنا رکھا تھا۔ اس وقت اسے چیزیں خریدنے کا بہت شوق تھا۔ وہ طرح طرح کے برتن خریدتی تھی۔ انواع واقسام کے کپڑے خریدتی تھی۔ طوطے اور مینے خریدتی تھی۔ انھیں دنوں اس نے ایک چھوٹی سی بچی کو بھی کسی سے خریدا تھا۔ جس کے مناسب ناک نقشے اور گورے چٹے ہاتھ پیر کو دیکھ کر وہ بہت خوش ہوئی تھی اور اس کا نام اس نے رام کلی رکھا تھا۔ رام کلی

فروخت کرنے والوں کو کہاں ہاتھ لگی تھی، یہ کسی کو معلوم نہیں تھا۔ خود وہ بھی اپنے بارے میں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں جانتی تھی کہ یہیں اس مکان میں اس کا بچپن گزرا ہے، یہیں اس کا لڑکپن گزرا ہے اور یہیں جوانی کے شب و روز گزر رہے ہیں۔ اسی بڑھیا نے اس کی پرورش کی ہے۔ یہی اس کی ماں ہے۔ یہی اس کی مالکن ہے۔ وہ اپنی زندگی کی موجودہ روش پر چلتی ہوئی اتنی دور نکل آئی تھی کہ اب اس وقت یہ سوچنا بھی اُسے فضول لگ رہا تھا کہ وہ کون ہے؟ اور کہاں سے آئی ہے؟ بلکہ اب وہ یہ سوچنے لگی تھی کہ اسے بھی موسی کی طرح کوئی بچی مل جاتی جسے وہ خرید لیتی اور اپنے آنے والے دنوں کے لیے اس کی پرورش کرتی۔ پھر موسی کے مرنے کے بعد وہ اس بچی کی موسی بن جاتی اور ٹھیک اسی طرح جس طرح کہ موسی اس پر حکم چلاتی ہے اور اسے اپنی ضعیفی میں استعمال کر رہی ہے، وہ بھی اس بچی کو اپنے تابع رکھتی اور اسے اپنے بڑھاپے کا سہارا بناتی۔ لیکن رام کلی پر موسی کی گرفت اتنی سخت تھی کہ اس کے لیے ایسی باتوں کا بس سوچ لینا ہی کافی تھا۔ اگر موسی کو معلوم ہو جاتا کہ رام کلی آزادانہ طور پر کچھ سوچ رہی ہے تو وہ اس کی ایسی سرزنش کرتی کہ وہ دوبارہ کچھ سوچنے کی جرات بھی نہیں کر پاتی۔

رام کلی ایک طوائف تھی یا ایک مزدور، یا پھر دونوں ہی۔ یہ بات قابل غور تھی اور اس کا فیصلہ کرنا ایک مشکل امر تھا۔ ہاں، اس کے روز کے معمول سے اس کی زندگی کا عنوان ڈھونڈا جا سکتا تھا۔ رام کلی کے روزانہ کے معمولات کیا تھے؟ وہ علی الصباح اٹھتی۔ گھر کی صفائی کرتی۔ کھانا بناتی۔ کپڑے دھوتی۔ موسی کے لیے غسل کا پانی بھرتی اور غسل کے بعد اسے کھانا کھلاتی۔ بعد ازاں بج سنور کر گھر کے دروازے پر کھڑی ہو جاتی۔ اس وقت وہ بازار حسن کا کھلا اشتہار بن جاتی۔ دن بھر آنے والے گاہکوں کو نپٹتی۔ ان گاہکوں میں طرح طرح کے لوگ ہوتے۔ کچھ اس سے دوگنی عمر کے ہوتے تو چند اس سے بہت کم عمر کے ہوتے۔ بدی کی زمین پر بھی کبھی نیکی کے پودے اگ آتے ہیں۔ ان لڑکوں کو دیکھ کر اسے ترس آ جاتا کہ وہ زندگی کی کس بھیانک راہ پر گامزن ہیں۔ وہ سوچتی کہ اگر

وہ ایک گھریلو عورت ہوتی تو اس کے پاس اس عمر کے بیٹے ہوتے۔ اکثر وہ ان نوعمروں کو سمجھا بجھا کر واپس بھی کر دیتی۔ ان نوخیزوں کو دیکھ کر کبھی کبھی رام کلی کے دل میں ممتا کے جذبات مچلتے اور ایک گھریلو زندگی کی آرزو تڑپتی۔ لیکن یہ کیفیت دیر تک قائم نہ رہتی۔ اس لیے کہ حالات کا جبر اتنا سخت تھا اور زندگی کی سچائیاں اتنی تلخ تھیں کہ یہ کیف آگیں احساسات بہت جلد حسرتوں کی قتل گاہ میں صلیب کا حسن بن جاتے۔ گاہکوں میں کوئی نشے میں دھت ہوتا تو کوئی سماج سے چھپ کر آنے والا شخص ہوتا جو بالکل چور کی طرح اس کے گھر کی سیڑھیاں طے کرتا۔ وہ دن بھر عجیب و غریب طرح کے تجربوں سے گزرتی اور طرح طرح کے برتاؤ کو جھیلتی۔ اس وقت نہ کسی کو اس کی علالت کا خیال رہتا اور نہ اس کی الجھن و پریشانی کا۔ سامنے گاہک ہوتے اور پیچھے اس کی موسی۔ پیسے کا حساب موسی کے پاس رہتا۔ لین دین کے معاملات میں اس کی مرضی کو ذرا بھی دخل نہیں رہتا۔ اس کی یہ مصروفیت شام کے وقت تک رہتی۔ دن بھر اس کی طبیعت پر شب بیداری کا اثر رہتا۔ اس کا جسم ٹوٹتا رہتا اور اس کی آنکھوں میں نیند مچلتی رہتی۔ اگر وہ کسی گھڑی اونگھ جاتی تو موسی چیخنے لگتی۔ ”رام کلی! کیا یہ سونے کا وقت ہے؟“

جب رات کا پہر شروع ہوتا تو رام کلی ایک بار پھر گھر کے کاموں میں الجھنے کو مجبور ہوتی۔ وہ رات کا کھانا بناتی اور موسی کو کھلاتی۔ موسی پوری رات گزارنے والے گاہکوں کا بھی انتظام کر لیتی۔ اکثر دو تین گاہک ایسے ہوتے جو رات کے اندھیرے میں آتے اور صبح کے اجالے سے قبل رام کلی کے پاس سے چلے جاتے۔ یہ لوگ الگ الگ کمروں میں جا بیٹھتے۔ رام کلی باری باری سب کے کمرے میں جاتی۔ دن بھر کی تھکی ماندی رام کلی تھوڑی دیر کسی گاہک کا دل بہلاتی۔ اسے چومتی۔ اس کے ساتھ پیار کرنے کا سوانگ بھرتی اور پھر اس کو نیند آنے لگتی۔ ایک مزدور کی طرح محنت کرنے والی رام کلی نیند میں بالکل غرق ہو جاتی۔ اس کا جسم کپڑوں سے بے نیاز ہو جاتا اور مرد سوئی ہوئی رام کلی ہی سے الجھتا رہتا۔ تھوڑی دیر کے بعد رام کلی کی نیند ٹوٹ جاتی۔ ایسا لگتا کہ لاشعور میں موجود کوئی

اسے بیدار کر دیتا۔ اسے یاد آ جاتا کہ دوسرے کمرے میں بھی موسی نے ایک مرد بٹھا رکھا ہے۔ وہ غنودگی کے عالم میں اس مرد کے پاس جاتی اور پھر وہاں بھی وہی سب کچھ ہوتا۔ یعنی تھوڑا سا سوانگ، تھوڑی سی جسمانی حرکت اور پھر رام کلی کی گہری نیند۔ رام کلی کو پھر احساس ہوتا اور وہ نیند کے حصار سے نکل کر تیسرے کمرے میں جاتی اور اس طرح رات بیت جاتی۔ کبھی کبھی کوئی گاہک رام کلی کے اس طرح سو جانے پر اپنی جھنجھلاہٹ کا اظہار کرتا اور موسی سے اس کی شکایت بھی کرتا۔ اجالا ہونے سے قبل، ہر ایک مرد، رام کلی کے ساتھ تنہا شب گزاری کا دعویٰ کرتا ہوا گھر سے باہر نکلتا۔ اب رام کلی ذرا اطمینان سے سونا چاہتی کہ موسی کی کھانسی شروع ہو جاتی۔ رام کلی سمجھ جاتی کہ وہ نیند سے بیدار ہو چکی ہے۔ وہ سویرے نیند سے بیدار ہونے کے بعد بستر ہی پر چائے پینے کی عادی تھی۔ لہٰذا رام کلی کو بستر چھوڑنا پڑتا۔ وہ موسی کو چائے دے کر فارغ ہوتی کہ رات والے مردوں کی طرح ایک لانبا اور تھکا دینے والا دن اس کے سامنے آ کھڑا ہوتا۔

رام کلی کا رات کے وقت گاہکوں کے سامنے سو جانا شہر میں مشہور ہو گیا تھا۔ اس قبیل کے مردوں میں جب اس کا ذکر ہوتا تو لوگ کچھ اس طرح کہتے ''ارے! رام کلی کو نیند بہت آتی ہے۔ اس کی فوں فوں سننے کون جائے گا۔ ہم لوگوں کو تو رت جگا چاہیے۔''

رام کلی کو بھی اس بات کا احساس ہو چکا تھا۔ وہ یہ دیکھ رہی تھی کہ موسی کی نگاہیں اب کچھ اور ڈھونڈ رہی ہیں۔ لہٰذا وہ اپنے مستقبل کے لیے فکر مند رہنے لگی تھی۔ اکثر اس کی نگاہیں فٹ پاتھ پر بجلی کے کھمبوں کے نیچے کھڑی بے رونق عورتوں کی طرف مرکوز ہو جاتیں اور اس پر ایک احساس خوف طاری ہو جاتا۔ پھر اسے طرح طرح کے ڈراؤنے خواب بھی آنے لگے تھے۔ جنھیں دیکھ کر وہ مزید خوف زدہ ہو جاتی اور چونک کر نیند سے بیدار ہو جاتی۔

لیکن ایک شب اس نے ایک ایسا خواب دیکھا جسے دیکھ کر وہ سخت متعجب ہوئی، اس نے دیکھا کہ

اس کا ایک آشنا اس کے پاس آیا ہے اور اس سے مخاطب ہوا ہے۔ ''رام کلی! تم میرے گھر چلو۔ میں تم سے شادی کروں گا اور زندگی بھر تمہارا ساتھ نبھاؤں گا۔'' رام کلی کو اس خوش رنگ پرندے کی باتوں پر بھروسا نہیں ہو رہا تھا۔ پھر بھی اسے یہ خواب بہت پسند آیا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کی لکیریں ابھر آئی تھیں اور اس شب زندگی میں شاید پہلی بار اسے ایک آسودہ نیند میسر ہوئی تھی۔

موت کی چھلانگ

وہ میٹرک کا امتحان دینے والا تھا۔ اس بار اس کے اسکول کا سینٹر کسی دور کے شہر میں پڑ گیا تھا۔ ابھی اس کی عمر ہی کیا تھی وہ بالکل ایک چھوٹا سا بچہ تھا۔ وہ بہت ہی کم عمری میں دسویں کلاس میں آ گیا تھا۔ پھر بھی اُسے امتحان دینے تو جانا ہی تھا خواہ اُسے تنہا ہی کیوں نہ جانا پڑتا۔ وہ کر بھی کیا سکتا تھا۔ اس کا خاندان بہت مختصر تھا۔ اس کے والد اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھے اور ماں نے اُسے بتایا تھا کہ وہ کوئی ایسی ملازمت کرتے ہیں جس کی خاطر انھیں کبھی ایک جگہ رہنا نصیب نہیں ہوتا ہے۔ وقفے وقفے سے تبادلے کا مرحلہ آتا ہے جس کے نتیجے میں کبھی اس شہر اور کبھی اس شہر میں قیام کرتے رہتے ہیں اور ہر ماہ کے پہلے ہفتے میں خانہ داری کے اخراجات کے لیے وہ جہاں کہیں بھی ہوتے ہیں وہاں سے ایک مناسب رقم بھیج دیا کرتے ہیں۔ اُسے یاد تھا کہ جب منی آڈر اس کے گھر آتا تھا اور اس روز ڈاکیا نذرانے کے لیے اس کے یہاں رکتا تو اس کے اور اس کی ماں کے درمیان جو گفتگو ہوا کرتی تھی تو اس میں ایسے ایسے شہروں کے نام آجایا کرتے تھے جن سے وہ اس وقت تک واقف بھی نہیں ہو سکا تھا۔ اُسے معلوم تھا کہ اس کے والد کو بہت کم فرصت ملا کرتی ہے۔ وہ سال میں فقط ایک یا دو بار گھر آیا کرتے تھے۔ اس کو ہمیشہ شوق رہا کہ کاش! وہ اپنے والد کے ساتھ خوب وقت گزارتا۔ ان کے ساتھ کھیلتا کودتا۔ بازار کی سیر کرتا۔ تہواروں کے میلے ٹھیلے کا لطف حاصل کرتا۔ لیکن وہ ان باتوں کی محرومی کا عادی ہو چکا تھا۔ اس کے باوجود وہ اپنے والد کو بہت پیار کرتا تھا۔ اس لیے تصور ہی میں وہ والد کے ساتھ ساری خوش گپیاں اور پر لطف تفریح کر لیا کرتا تھا۔ یہ سوچ کر بھی اُسے اطمینان ہو جاتا تھا کہ اس کے دوست منوہر کے والد بھی تو فوج کی

ملازمت کرتے ہیں اور وہ بھی تو بہت کم گھر آتے ہیں پھر بھی اُس کے گھر کے افراد خوش وخرم زندگی گزار رہے ہیں۔ وہ بھائی بہنوں میں سب سے بڑا تھا۔لہٰذا اس کی ماں ہی اس کے ساتھ امتحان کے سینٹر جا سکتی تھی۔لیکن یہ بھی ممکن نہیں تھا۔اس لیے کہ ایک تو گاؤں میں اس قسم کا رواج نہیں تھا اور دوسرے یہ کہ چھوٹے بچوں کو چھوڑ کر اس کی ماں کہیں جا بھی نہیں سکتی تھی۔غنیمت تھا کہ اس کے گاؤں کے اور بھی کئی لڑکوں کا سینٹر اسی شہر میں پڑ گیا تھا۔اس کی ماں نے اُسے اس کے ساتھیوں کے ہم راہ کر دیا تھا اور ان لڑکوں میں جو سب سے زیادہ ہوشیار تھا اُسے اپنے بیٹے کا نگہبان بنا دیا تھا۔

امتحان شروع ہونے سے دو روز قبل وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ شہر پہنچا۔ایک مسافر خانے میں ان لوگوں نے کرایے پر ایک کمرہ لیا اور پڑھائی میں مصروف ہو گئے۔ دو دن کے بعد ان لوگوں کا امتحان شروع ہوا۔جس میں وہ سب مستعدی سے شریک ہوئے۔ یوں تو وہ پڑھائی لکھائی اور امتحان کے پرچوں کو دل جمعی سے انجام دینے میں محو تھا۔لیکن ایک بات کے لیے اس کا دل اکثر بھٹک جاتا۔شہر میں مینا بازار لگا ہوا تھا جو اس کی کشش کا سبب بن گیا تھا۔وہ مینا بازار کے اشتہار کو آتے جاتے دیکھتا۔کبھی اس کی پرچار گاڑی سے دوچار ہو جاتا۔ مینا بازار میں بہت سارے پروگرام تھے۔بچوں کی دلچسپی کے بھی بہت سارے سامان موجود تھے۔سب سے اہم چیز جو اس مینا بازار کے بارے میں اس نے سن رکھی تھی...... وہ تھی ''موت کی چھلانگ'' موت کی چھلانگ کی وجہ سے وہ بہت متجسس تھا۔اس نے بازار میں لگے اشتہاروں میں دیکھا تھا کہ ایک آدمی اپنے جسم میں آگ لگا کر بہت اونچائی سے نیچے ایک کنواں میں چھلانگ لگاتا ہے۔وہ آتے جاتے جب بھی اس اشتہار کو دیکھتا تو اسے دیکھ کر حیرت کا احساس ہوتا تھا۔اشتہار میں چھپی تصویر کے بارے میں سوچتا کہ کیوں انسان اس طرح کے خطرناک کاموں کو انجام دینے کا ذمہ لیتا ہے۔وہ پھر سوچتا کہ کوئی شوق سے تو اس طرح کا خطرہ مول نہیں لے سکتا ہے۔ضرور اس کی کوئی مجبوری رہی ہوگی۔

پھراس کے دل سے ہی یہ جواب بھی مل جاتا کہ روٹی حاصل کرنے کے لیے نہ جانے انسان کو کیا کیا کرنا پڑتا ہے اور نہ جانے کتنے روپ بدلنے پڑتے ہیں۔ اس کے دل میں اکثر یہ سوال بھی اٹھتا کہ کیا وہ چھلانگ لگانے والے آدمی کی تصویر میں کوئی لگاؤ یا اپنا پن تو نہیں پاتا اور جس کی بنا پر وہ مینا بازار سے جذباتی طور پر جڑ گیا ہے۔ اس طرح کی کرید اور الجھن میں وہ برابر الجھ جاتا۔ لیکن امتحان کی مصروفیت نے بہر حال اس کے ذہن کو متعین رکھا اور وہ تفکرات کے گرداب میں پھنسنے سے بچ گیا۔ لیکن اس نے یہ فیصلہ تو کر ہی لیا کہ وہ امتحان کے بعد مینا بازار ضرور دیکھے گا۔ اُسے موت کی چھلانگ دیکھنے کی آرزو بے چین کیے ہوئے تھی۔

آخری پرچہ دے کر جب وہ مسافر خانہ واپس آیا تو اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ "میں مینا بازار دیکھ کر ہی گھر واپس جاؤں گا۔" تھوڑی سی ہاں ناں کے بعد اس کے سبھی ساتھی اس کے ساتھ مینا بازار جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ چونکہ امتحان ختم ہو گیا تھا اور بہت سارے دوسرے لڑکے بھی مینا بازار دیکھنے آ گئے تھے۔ اس لیے بھیڑ بہت زیادہ ہو گئی تھی۔ ان لوگوں نے ٹکٹ خریدا اور اندر داخل ہوئے اور مینا بازار میں لگی دکانوں کی سیر کرنے لگے۔ رنگ برنگ کے غبارے طرح طرح کے کھلونے اور انواع و اقسام کی چیزیں ان دکانوں میں سجی ہوئی تھیں۔ کچھ خرید کر ان لوگوں نے کھایا بھی۔ پھر یہ لوگ جھولے کے پاس گئے۔ دیگر ساتھیوں کے متعلق وہ نہیں کہہ سکتا لیکن اس کا دل کہیں بھی نہیں لگا۔ وہ مینا بازار کے سب سے اہم پروگرام موت کی چھلانگ کو دیکھنے کے لیے بے قرار تھا۔ رات کے آٹھ بجے اس پروگرام کے شروع ہونے کا وقت تھا۔ وہ اپنے ساتھیوں کو مینا بازار میں گھومتا ہوا چھوڑ کر وقت سے پہلے موت کی چھلانگ کی جگہ پر چلا آیا اور سب سے آگے کی صف میں بیٹھ گیا۔ اس جگہ کو ایک بڑے سے گڑھے کے اندر محفوظ کر لیا گیا تھا۔ نیچے ایک بڑا اور گہرا کنواں تھا جس میں پانی بھرا ہوا تھا اور اس کے اوپر ایک لمبی اونچی سیڑھی کے بعد ایک پلیٹ فارم بنا ہوا تھا۔ رفتہ رفتہ لوگ جمع ہونا شروع ہوئے اور آٹھ بجتے بجتے وہاں

تماش بینوں کی بھیڑ یکجا ہوگئی۔ پروگرام کے آغاز کے قبل رنگین روشنیاں جھلملائیں۔ لاؤڈ اسپیکر سے پروگرام کی تعریف میں بہت کچھ کہا گیا۔ اب ایک آدمی آہستہ آہستہ سیڑھی چڑھتا ہوا اوپر بنے پلیٹ فارم پر کھڑا ہو گیا۔ رات کے تقریباً ساڑے آٹھ بجے پروگرام کا آغاز ہوا اور سب سے پہلے پلیٹ فارم پر موجود آدمی نے اپنے جسم پر تیل چھڑکا۔ وہ بچہ نیچے بیٹھا ہوا انتہائی انہماک سے اس پروگرام کو دیکھ رہا تھا۔ وہ شخص جب سیڑھیاں چڑھ کر اوپر جا رہا تھا تو اس وقت اس کی پیٹھ دکھائی پڑ رہی تھی لیکن جب وہی شخص اوپر پہنچ کر اپنے جسم پر تیل چھڑکنے لگا تو اس کا چہرہ سامنے آیا اور روشنی میں صاف نظر آنے لگا۔ اس بچے نے اس چہرے کو بغور دیکھا۔ اشتہار میں چھپی تصویر اس کی آنکھوں میں کوندگئی اور ایک بار پھر وہی سارے سوالات ذہن میں پیدا ہونے لگے جو اُسے چند دنوں قبل مضطرب کیے ہوئے تھے۔ اسے ایک بار پھر محسوس ہوا کہ وہ اس چہرے سے اچھی طرح مانوس ہے۔ اس نے کھڑے ہو کر اس آدمی کو پہچاننے کی کوشش کی۔ اوپر پلیٹ فارم پر کھڑے آدمی نے بڑے اطمینان کے ساتھ اپنے جسم پر تیل چھڑکنے کا کام انجام دیا۔ پھر اُس نے اوپر ہی سے چاروں طرف موجود لوگوں کو دیکھا۔ اُنھیں جھک کر سلام کیا اور ایک دل آویز تبسم کے ساتھ ماچس کی جلتی ہوئی تیلی اپنے جسم کو دکھادی۔ ایک شعلہ سا بھڑکا اور پھر وہ آگ کی لپٹوں میں گھر گیا۔ اب وہ کچھ بھی نہیں تھا بلکہ اس کا مکمل وجود شعلوں میں تبدیل ہو چکا تھا۔ وہ بچہ اوپر کھڑے آدمی کو دیکھ کر مضطرب تو قبل ہی سے تھا۔ لیکن جب اس نے آگ کے شعلوں میں اس کے چہرے کو بالکل صاف طور پر دیکھا تو اُسے ذرا بھی دھوکا نہیں ہوا اس کے شعور میں اس کے والد کا جو خاکہ موجود تھا اس کا راز اب نہاں نہیں رہا۔ ہر بات عیاں ہو چکی تھی۔ آگ میں لپٹے آدمی پر اس بچے کو بہت ترس آیا۔ اُسے محسوس ہوا کہ وہ بھی آگ کی لپٹوں میں گھرا ہوا ہے۔ اُسے اپنے بدن میں بے انتہا جلن کا احساس پیدا ہوا۔ پھر اس کا اندر باہر سب جلنے لگا۔ جیسے اس کا پورا وجود جل اٹھا ہو۔ سوز دروں نے اسے تلملا کر رکھ دیا۔ پیاس سے اس کی زبان اینٹھنے لگی۔ اس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں اور وہ

بے اختیار چیخ اٹھا۔ ''ابا'' پلیٹ فارم پر کھڑے آدمی نے شعلوں میں گھرے ہونے کے باوجود تقریباً رقص کرتے ہوئے ایک بار پھر سب کو سلام کیا اور ایک طرح دار انداز میں نیچے کنویں میں چھلانگ لگادی۔ مجمع خوشی میں جھوم اٹھا۔ بچے کی جذبات بھری ''ابا'' کی پکار تالیوں کی گڑگڑاہٹ اور واہ! واہ!! کے شور میں دب چکی تھی۔

ماضی کے گھر کا دروازہ کس طرح کھولوں؟

جی ہاں! یہ میری نئی کٹیا ہے۔ لوگ اسے نوتعمیر شدہ مکان بھی کہنے لگے ہیں۔ یہ مکان نہیں ہے بلکہ میرے شعور میں جاگزیں میرے ماضی کے مختلف عکس کا ایک آئینہ ہے۔ اس مکان کو محسوس کر کے مجھے وقت کی بہتی ہوئی وہ ندی یاد آجاتی ہے جس پر بیس برس کا لمبا پل پھیلا ہوا ہے اور جس سے ہو کر میں آخری بار بیس سال قبل اس شہر میں آیا تھا پھر اس پل پر سے کبھی نہیں گزر سکا۔ حالانکہ میرے خیالوں میں ندی کے اُس پار کی وہ تمام باتیں ہنوز تازہ ہیں جن سے کبھی میرا قلبی واسطہ تھا۔

وہ مکان مجھے اب تک یاد ہے جس کا رقبہ عام مکانوں سے مختلف تھا اور جس کی وراثت بھی عام گھروں سے جدا تھی اور شاید اسی لیے اسے حویلی کے نام سے مشہور کر دیا گیا تھا۔ گو کہ یہ حویلی اب کچھ حالات کے ہاتھوں اور کچھ اپنے مکیں کی بے اعتنائی کا شکار ہوتی جا رہی ہے۔ اس میں شکوہ رفتہ کے نشانات معدوم ہوتے جا رہے ہیں پھر بھی مجھے باہری بیٹھک کا وہ کمرہ ہر وقت یاد رہتا ہے جس میں ایک چارپائی ہوا کرتی تھی۔ وہ کمرہ اس وقت میری جائے پناہ تھی جب میں ایم اے کر کے روزگار کی تلاش میں سرگرداں تھا۔ اس چارپائی میں دکھ جذب کر لینے کی زبردست صلاحیت موجود تھی۔ دن بھر کا تھکا ماندہ جب میں گھر لوٹتا تو اس کمرے میں پڑی اس چارپائی میں سما جاتا۔ مجسم خلیق اور مہربان چارپائی کے جسم سے خلوص کے ہاتھ نکلتے۔ اس کی محبت بھری باہیں پھیلتیں اور وہ مجھے آغوش میں لے لیتیں۔ اس وقت مجھے اپنی والدہ مرحومہ کی یاد آجاتی جب وہ بچپن میں مجھے اپنی آغوش میں بھر لیا کرتی تھیں۔ اب بیوی بھی مصیبت کی گھڑی میں اپنی باہوں میں سمیٹ کر سارے دکھوں کو اپنا حصہ بنا لیتی ہے۔ یہ بیوی بھی پتہ نہیں کیوں ماں کا روپ لے لیتی ہے

اور اس کی انگلیوں میں وصال کی لذت کے بجائے مامتا کی تڑپ محسوس ہونے لگتی ہے۔ میں اس چارپائی کی باہوں میں کھو کر گھر کی جھڑکیوں اور زمانے کی تلخیوں کو فراموش کر دیتا تھا اور پھر آنے والے کل کی تپش آمیز دھوپ سے نبرد آزما ہونے کے لیے خود کو تیار کر لیتا تھا۔ لیکن وہ کمرہ بہت دنوں تک مجھے راس نہیں آسکا تھا۔ ایک بار میں چند دنوں کے لیے کہیں باہر گیا ہوا تھا تو میری غیر موجودگی میں میری محبوب چارپائی کمرے سے باہر نکال دی گئی تھی اور کمرے کو مقفل کر دیا گیا تھا۔ میرے ایک بزرگ جن کی ملکیت میں یہ کمرہ تھا۔ انھوں نے اس میں اناج محفوظ کر کے مجھے وہاں سے بے دخل کر دیا تھا۔ اس وقت مجھے لگا کہ صرف میری چارپائی کمرے سے باہر نہیں نکالی گئی تھی بلکہ مجھے اس گوشۂ عافیت اور ان غم خوار در و دیوار سے محروم کر دیا گیا تھا۔ جو شب و روز کے کرب میں میرے سکون کا آخری سامان تھے۔

اس آبائی مکان کی باہری بیٹھک کی بھی اپنی ایک خاص روایت تھی۔ لمبی چوڑی بیٹھک، چند ستونوں پر مشتمل صحن اور سامنے ایک بڑا سا میدان۔ میدان میں کنارے کی طرف نیم کے کئی پیڑ تھے اور میدان کی ایک جانب ایک امام باڑہ تھا۔ باہری بیٹھک، میدان پیڑ اور امام باڑہ مل کر ایک پرکشش اور پرتجسس پس منظر کی تشکیل کیا کرتے تھے۔ باہری بیٹھک اور میدان محلے کی سماجی تقریبات کے کام بھی آتے تھے۔ پاس پڑوس کی شادیوں میں آنے والی باراتیں وہیں ٹھہرا کرتی تھیں اور جب محلے کے بیشتر لوگوں کی زندگی مفلسی سے دوچار تھی۔ انھیں رہنے کے لیے مناسب جگہ حاصل نہیں تھی تو اکثر گھروں کے مرد اسی بیٹھک میں آکر سویا کرتے تھے۔ محرم کے ہنگامے بھی اسی باہری بیٹھک اور سامنے کے میدان میں انجام پاتے تھے۔ وہیں تعزیہ بنتا۔ ڈھول بجائے جاتے۔ نوجوان لاٹھی، شمشیر اور نیزے وغیرہ کے کھیل دکھاتے منتیں مانی جاتیں۔ بچوں سے لے کر بوڑھوں تک کے لیے مصروفیت کا سامان پیدا ہو جاتا۔ ان تماشوں کو دیکھتے رہنے کے علاوہ جب کبھی مجھے جہد زندگی سے فرصت نصیب ہوتی تو میں باہری بیٹھک میں دیر تک آرام کرتا اور آتے

جاتے لوگوں سے سلام کلام کر کے سماجی رفاقت کے رشتوں کو ترو تازہ بنائے رکھتا۔ ایک بات جو سب سے زیادہ افادیت کی حامل اس باہری بیٹھک کے سلسلے میں یہ تھی کہ اس کی دہلیز ہمارے لیے گھڑی کا کام کیا کرتی تھی۔ کس موسم میں دہلیز پر دھوپ کہاں رہے گی یا پھر اس وقت کیا بجا ہوگا۔ یہ اندازہ ہمیشہ درست ثابت ہوتا۔ جس طرح کوئی ماہر اپنی چھڑی سے زمین ٹھونک کر پانی کی موجودگی کا راز افشا کرتا ہے۔ اسی طرح ہم لوگ وقت کا حساب بتانے میں دہلیز اور میدان کی دھوپ دیکھ کر ماہر ہو گئے تھے۔

اس دھوپ گھڑی سے وقت کا اندازہ کرتے ہوئے نہ جانے زندگی کے کتنے ابواب سے گزر رہوا۔ اس درمیان میں کٹی پتنگ کی طرح زندگی میں کہاں کہاں نہ بھٹکا اور برس ہا برس شاہراہوں کی دھول بنا رہا۔ ان گزرے ہوئے شب و روز کی کہانی بھی جدا ہے۔ اب جبکہ زندگی میں تھوڑا استحکام حاصل ہوا ہے اور سر چھپانے کے لیے ایک چھت مل گئی ہے تو پھر وہی برسوں پرانا گھر، دیرینہ یادوں کا سلسلہ میرے شعور میں ابھر کر چلا آیا ہے۔ یہ چھوٹا سا نو تعمیر شدہ مکان تصور کے آئینے میں بالکل میرے آبائی مکان جیسا نظر آتا ہے۔ گھر کے مردانہ حصے میں، ایک کمرا، ایک باہری بیٹھک اور سامنے کھلی جگہ، حالانکہ اب یہ سب کچھ انتہائی چھوٹی سی جگہ میں ہے جس طرح کوئی مہاجر قیام کی اپنی نئی جگہ میں زمین کے کسی ٹکڑے یا کسی پیڑ کی مشابہت میں یا خزاں رسیدہ ٹہنیوں میں پھنسے اُداس چاند کے کسی منظر کو دیکھ کر اپنا وطن یاد کر لیتا ہے اور اس یاد سے مسرور بھی ہوتا ہے اور رنجیدہ خاطر بھی اسی طرح میں بھی جب اپنے مکان میں ہوتا ہوں تو مجھے احساس ہوتا ہے کہ میں بیس سال لمبے پل کے اس پار ابھی نہیں آیا ہوں اور ابھی میں وہی ہوں جہاں میرا بچپن، میری نوجوانی اور جہاں میری جدوجہد کے دکھ بھرے دن گزرے ہیں۔ لیکن تصورات کے آنگن میں کھڑا کھڑا میں پریشان ہو جاتا ہوں کہ تصویر تو میں نے اپنے ماضی کی بنالی ہے لیکن میں اس میں رنگ کہاں سے بھروں گا۔ کہاں سے میں اس میں زندگی کی آب و تاب لاؤں گا۔ اس وقت سب

کچھ ہے لیکن وہ چارپائی کہاں ہے؟ وہ مہربان بانہیں کہاں ہیں؟ اور زندگی کے وہ ہنگامے کہاں ہیں؟ کیا میں اُنھیں ڈھونڈ سکوں گا؟ سائنسی ایجادات عیش وعشرت کے بہت سارے لوازمات پیش کر سکتے ہیں لیکن وہ ماضی کے بیتے لمحوں کو نہیں لوٹا سکتے۔ اُنھیں حیات تو نہیں بخش سکتے ہیں۔ چند دنوں قبل میرے بھائی نے اشوک کے چند پیڑ میری اس نئی قیام گاہ کے چھوٹے سے احاطے میں لگادیے ہیں جو کئی برسوں بعد بڑھ کر دراز قد، سمٹے سمٹائے پیڑ میں تبدیل ہو جائیں گے۔ میں نے اُنہیں ''محبت کے پیڑ'' کا نام دیا ہے۔ میں انتظار کروں گا کہ یہ پیڑ جوان اور شاداب ہو جائیں تا کہ میں ان میں، ان کھوئے ہوئے درختوں کی موجودگی محسوس کر سکوں جو اب بھی میرے ماضی میں تازہ وایستادہ ہیں اور تب شاید میرے شعور کے کینوس پر بنی وہ تصویر مکمل ہو سکے گی جس کا خلا میں پوری شدت کے ساتھ محسوس کرتا رہا ہوں۔

میرے اندر کا صحرا!

اس سے قبل میں جس علاقے میں رہتا تھا وہاں سے کالج جانے کا صرف ایک ہی راستہ تھا اور وہ راستہ بازار ہو کر جاتا تھا۔ اس راستے میں لوگوں کی بھیڑ، ہنگامے اور طرح طرح کی آلودگیاں شامل تھیں۔ لیکن جب میں منتقل ہو کر نئے علاقے میں آباد ہوا تو یہاں سے مجھے کالج جانے کے لیے دو راستوں کی سہولت میسر ہو گئی۔ ایک راستہ قبل کی طرح بازار سے ہو کر اور دوسرا کھیتوں کی طرف سے تھا۔ یہ عجب اتفاق تھا کہ شہر کی گنجان آبادی میں یہ علاقہ اب بھی غیر آباد تھا اور لوگ یہاں کاشت کاری کرتے تھے۔ اس علاقے کے آخری سرے پر ہمارا کالج تھا۔ جب پہلی بار اس راستے پر میری نظر پڑی تھی تو مجھے بے حد مسرت کا احساس ہوا تھا۔ ایک تو یہ کہ یہ راستہ پچھلی راہ سے کچھ چھوٹا تھا اور دوسری بات یہ کہ وہ ہرے بھرے کھیتوں سے ہو کر گزرتا تھا۔ یہاں دور تک اقامتی عمارتیں نہ تھیں۔ گندے نالوں کا ذکر نہ تھا۔ کوڑے کے ڈھیر سے واسطہ نہیں پڑتا تھا۔ ماحول میں آلودگی اور گھٹن دور دور تک نہ تھی۔ سب کچھ بالکل صاف ستھرا اور ہر منظر سبزہ رنگ تھا۔ کھیتوں کی مینڈوں کے کنارے کنارے بہت سے درخت تھے جن کے عقب میں پھر کھیتی باڑی اور پھلوں کے باغوں کے سلسلے تھے۔ میں نے اسی راستے کو کالج جانے کے معمول کے لیے اختیار کیا تھا۔ راستے میں کھجوڑ، آم، املتاس، گل مہر اور نیم وغیرہ کے پیڑ میرے لیے دلچسپی اور دلکشی کا باعث تھے۔ گندم کی فصل کے زمانے میں سبز پودے ہوا میں لہلہاتے تو محسوس ہوتا کہ یہ کھیت نہیں دریا ہے اور ایک سبز موج اس کنارے سے اس کنارے تک لہرا رہی ہے۔ فروری یا مارچ کے مہینے میں جب دھوپ کی تپش بھلی معلوم ہوتی ہے، گندم کے خوشے سنہری رنگت اختیار کر لیتے ہیں اور ان

کے دانے مٹھاس اور غذائیت سے لبریز ہو جاتے ہیں۔ میں چلتے چلتے ان خوشوں کو چھو لیتا، کبھی ان کے سر پر اپنا ہاتھ رکھ دیتا۔ جیسے بچوں کے سر پر کوئی ہاتھ رکھے، تو مجھے خلوص اور پیار کی نرم تمازت محسوس ہوتی۔ سرسوں کی فصل میں زعفرانی رنگت جب کھیتوں پر چھا جاتی تو لگتا کہ کوئی بھری جوان عورت سنہرا زعفرانی دوپٹہ اوڑھے اپنے بانکپن سے فطرت کا دل موہ رہی ہے۔

وقت گزرتا رہا۔ پھول اور پھل بدلتے موسموں اور گزرتے ہوئے وقتوں کی بہترین علامت ہیں۔ راستہ چلتے ہوئے پودوں اور پیڑوں کی ٹہنیوں پر مسکراتے ہوئے پھول اور پھل خود ہی بتا دیتے ہیں کہ وقت کے دروازوں پر اب کون سا موسم دستک دے رہا ہے۔ میں جب اس راستے سے ہو کر کالج جاتا تو مجھے سارے راستے بدلتے رنگوں اور طلوع ہوتی ہوئی صبحوں اور ڈوبتی ہوئی شاموں جیسا احساس ہوتا رہتا۔ اس وقت میں فطرت سے بالکل ہم آہنگ ہو جاتا۔

فطرت سے روبرو ہونا مجھے ہمیشہ اچھا معلوم ہوتا ہے۔ ابھی چند دن قبل میں مانسون کی پہلی بارش میں ایک لوکل ٹرین کی کھڑکی کے پاس بیٹھا بارش کے چھینٹوں سے بھیگ رہا تھا تو کئی مسافروں نے مجھے از راہ کرم بارش سے بچنے کے لیے اپنی جگہ دینی چاہی۔ لیکن میں تو اپنے شوق سے پانی میں بھیگ رہا تھا۔ انھیں اگر یہ بات معلوم ہو جاتی تو وہ شاید ہنسنے لگتے۔ لیکن میں مُسکرا کر ان کی پیش کش کو ٹالتا ہوا اپنی جگہ پر بیٹھا رہا۔ میں نے بارہا سورج کے طلوع وغروب کا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ چاند کس طرح سفر کرتا ہے اور بادل اس سے کس طرح ناز کرتے ہیں اور تاروں کی برات کس طرح تاریک راتوں میں مسافروں کو راہ بتاتی ہے، یہ مناظر میری آنکھوں میں اور میرے دل میں محفوظ ہیں۔

کالج کے ہرے بھرے راستے میں طبیعت بالکل بشاش رہتی۔ بڑھتی عمر کی افسردگی کہیں گم ہو چکی ہوتی، گل مہر کی سرخ بہار اور املتاس کی زرد آگ میرے دل کو لبھا لیتی اور مجھ پر بے ساختہ نشے کا سا

عالم طاری ہو جاتا۔ ان راستوں سے گزرتے ہوئے مجھے کسانوں اور ان کے اہل وعیال سے بھی روبرو ہونے کا موقع ملتا۔ کاشت کاری میں میری دلچسپی دیکھ کر کسان مجھ سے مخاطب ہوتے اور پھر بے تکلف ہو جانے کے بعد ان سے کاشت کاری کے علاوہ دیگر موضوعات پر بھی باتیں ہوتیں۔ میں ان کی فصلوں کے پردے میں ایک نئی وسیع اور تازہ کائنات سے متعارف ہوتا۔ ان کی فصلوں کے بیمار پودوں سے مجھے خاص طور پر ہمدردی ہو جاتی اور میں ان کے دوا علاج میں دلچسپی لینے لگتا۔ کسان مجھ سے پوچھتے کہ صاحب آپ تو شہری آدمی ہیں، آپ کو کھیتی باڑی کے اتنے گر کیسے معلوم ہوئے۔

ان راستوں سے ہوتا ہوا جب میں کالج جاتا تو مجھے بہت سارے خاروخس اور خودرو پودوں سے بھی واسطہ پڑتا۔ میں تو ان کو پگڈنڈیوں پر روندتا ہوا آگے بڑھ جاتا لیکن وہ تھے کہ مسکرا کر مجھے خوش آمدید کہتے نظر آتے۔ ان کے بے مایہ پھول مجھے اس طرح دیکھتے کہ گمان ہوتا کہ اب وہ مجھ سے بات ہی کرنے لگیں گے۔ عجب اتفاق تھا کہ میں نے اپنی تحقیق کے لیے جو موضوع اختیار کیا تھا وہ خاروخس پر ہی مبنی تھا۔ میں سوچتا کہ میں خود بھی تو ایک خودرو پودا ہوں جو زمانے کے پاؤں تلے روندا جاتا رہتا ہوں۔ سبزۂ نورستہ رہ گزار کا ہوں۔ سر اٹھایا کہ ہو گیا پامال۔ تشنہ لب اور ناتراشیدہ جھاڑ جھنکاڑ بھی کبھی مہذب ہاتھوں اور آراستہ گلدانوں میں نہیں سجتے۔ میں نے اپنی تحقیق کے دوران ان جنگلی جڑوں، پتیوں اور پھولوں کا بغور مطالعہ کیا ہے۔ انھیں اکھاڑ کر محفوظ کیا ہے۔ اُنہیں نوچ کر اور توڑ کر دیکھا ہے۔ یہ پودے ہچکچاہٹ اور شکوہ وشکایت کے بغیر میرے پاس محفوظ ہوتے رہے۔

پھر ایک وقت ایسا بھی مجھ پر گزرا جب میری تحقیق میں ایک رخنہ آگیا اور مجھے لگا کہ اب میں اس کام کو مکمل نہ کر سکوں گا۔ اس زمانے میں جب میں کھیتوں سے گزرتا تو محسوس ہوتا کہ خاروخس کو بھی میری ناکامی کا علم ہو چکا ہے اور اب وہ مجھے پر ہنس رہے ہیں۔ میری تحقیر کر رہے ہیں۔ مجھے لگتا

جیسے وہ مجھ سے پوچھ رہے ہوں کہ کیا ہوا ہمارے بھائیوں کا جنھیں تم ہماری زمین سے علاحدہ کر کے لے گئے تھے اور کہا کرتے تھے کہ میں تمہارا نام چاردانگ عالم میں روشن کروں گا۔ ان دنوں میں ان کے سرخ، گلابی، سیاہ، سفید چہروں سے نظریں بچا کر چلتا۔ لیکن وہ مشکل زمانے گزر گیے اور میں دوبارہ اپنے کام میں منہمک ہو گیا۔ پھر جب میری تحقیق مکمل ہوئی تو مجھے اعتماد حاصل ہوا اور مجھے ان سے نظریں چرانے کی ضرورت باقی نہیں رہی۔

میں کالج جاتے ہوئے کھیتوں کی لہلہاتی فصلوں سے روبرو ہوتا، ان کے رخساروں کو چھوتا، کھیتوں میں کام کرتے ہوئے کسانوں سے باتیں کرتا۔ دور ایستادہ درختوں پر میری نظر جاتی تو ذہن میں خیال آتا کہ میں نے انھیں کہیں دیکھا ہے۔ پگڈنڈی پر چلتے ہوئے مکئ، گیہوں اور سرسوں کے پودوں کے درمیان سانس لیتا تو فصلوں کی جانی پہچانی خوش بو دور تک میرے سینے میں سما جاتی۔ یہ تمام چیزیں تو میری بالکل شناسا ہیں! پھر مجھے احساس ہوتا کہ میں کالج جاتے ہوئے کھیت کے ٹکڑوں سے نہیں گزر رہا ہوں بلکہ میں اپنی زندگی کی ڈگر سے گزر رہا ہوں۔ یہاں میرا ماضی کھیتوں، پگڈنڈیوں اور فصلوں میں چھپا ہوا مجھ سے ملنے کے لیے تڑپ رہا ہے۔ مجھے اس وقت بہت کچھ یاد آ جاتا۔ مجھے وہ ہلواہے یاد آ جاتے جو اکثر فاقہ کش تھے۔ لیکن ہمارے یہاں کام کرتے جب ہم ان کو نام سے پکارتے تو والدین سے ڈانٹ سنتے کہ ان کو چاچا، ماما، بھیا وغیرہ کیوں نہیں کہتے ہو؟ مجھے وہ جفاکش سفید رنگ کا بیل یاد آ جاتا جس کی موت پر گھر کے لوگ روئے تھے اور اس روز کسی نے سیر ہو کر کھانا نہیں کھایا تھا۔ اس روز میں ان لوگوں کے رونے کا مطلب بخوبی نہیں سمجھ سکا تھا لیکن جب میں نے دنیا کے رنج اور رنگ دیکھے تو میں نے جانا کہ کسان، کھیت اور بیل کا رشتہ کیا ہے اور اس روز میرے گھر کے لوگ اس خوب صورت سفید، صحت مند بیل کی موت پر کیوں روئے تھے۔ میں پگڈنڈی پر دھیرے دھیرے چلنے لگتا اور دل میں کہتا کہ کاش یہ راستے کبھی ختم نہ ہوں۔

وقت گزرتا رہا اور میں بھی حسب معمول ان راستوں سے گزرتا رہا۔ میرے سینے میں فصلوں کی خوش بو سماتی رہتی اور میرے دل و دماغ بچپن، لڑکپن اور نوجوانی کی یادوں سے معطر ہوتے رہتے۔ اسی دوران ایک بار موسم گرما کی تعطیل آئی اور میں تعطیلات میں کہیں باہر چلا گیا تھا۔ جب میں شہر واپس آیا تو کالج جاتے ہوئے میرے دل میں اچانک یہ خیال گونجا کہ اتنی طویل غیر حاضری کے بعد راستے کے پیڑ مجھ سے کیا پوچھیں گے؟ کھیتوں میں کون سی فصل کھڑی ہوگی؟ شاید مکئی کے پودے ہوں۔ ہوا میں لہراتے ہوئے دھانی دوشالہ اوڑھے ان کے بھٹے مجھ سے خفا تو نہ ہوں گے؟ اس بیچ کیا بیتی ان پر؟ کہیں وہ مجھ سے یہ نہ کہیں کہ تم آدم زاد کیسے بے وفا ہو کہ خود تو کسی اور دنیا کی سیر کرنے چلے گئے اور ہمیں یہیں چھوڑ گئے؟

میں ان سوالوں سے الجھتا ہوا اور ان کے جواب ڈھونڈتا ہوا آگے بڑھا تو مجھے کہیں کچھ نظر نہیں آیا۔ تمام علاقہ سپاٹ ہو چکا تھا۔ لوگ دوڑ بھاگ رہے تھے۔ فیل قد مشینیں سڑکوں پر اینٹیں اور پتھر اور فولاد لا رہی تھیں۔ زمینوں کی پیمائش ہو رہی تھی۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہ لگی۔ کھیتوں کا یہ پورا علاقہ کسی ہاؤسنگ سوسائٹی نے خرید لیا تھا۔ یہاں بھی وہی ہوا تھا جس کا مجھے اندیشہ لگا ہوا تھا۔ اکثر میرے دل میں یہ وسوسہ پیدا ہوتا تھا کہ کنکریٹ کے پھیلتے جنگل میں کہیں ایک دن میرا یہ راستہ بھی گم نہ ہو جائے۔ مجھ سے میرے ہم راز میرے اپنے لوگ چھین لیے گئے۔ میں نے اپنے دل میں ایک کسک اور بے چینی محسوس کی میرے پاؤں من من بھر کے ہو گئے۔ سست لڑکھڑاتے قدموں سے کالج پہنچا۔ کسی نہ کسی طرح اپنی تدریسی ذمہ داریاں پوری کر کے میں گھر جانے کے لیے تیار ہوا۔ میرے قدم آپ ہی آپ کھیت والے راستے کی طرف مڑے لیکن فوراً ہی میں نے رخ موڑ کر بازار کی طرف کا راستہ اختیار کر لیا۔

اور اب میں ہمیشہ بازار ہو کر کالج جاتا ہوں۔ ہاں کبھی کبھی غیر شعوری طور پر میرے قدم اس پرانے راستے کی طرف اٹھ جاتے ہیں جہاں آج ہریالی کے مقبروں پر جابر عمارتیں کھڑی ہیں۔

مجادلہ

اسے میں نے پوسٹ آفس میں دیکھا۔ وہ میرے سامنے سے گزری۔ اس نے بھی مجھے بغور دیکھا لیکن اس نے میرا کوئی نوٹس نہیں لیا اور آگے بڑھ گئی۔ مجھے سخت حیرت ہوئی کہ وہ کیوں اس بے تعلقی اور بے نیازی کے ساتھ میرے سامنے سے گزر گئی؟ میں اپنے دل کو ٹٹولنے لگا کہ آخر ایسا کیوں ہوا؟ اس کا ایک مشکوک سا سبب بھی میری سمجھ میں آیا۔ لیکن وہ اتنا قوی ہوگا اس کا مجھے اندازہ نہیں تھا۔ بہرحال وہ اندر چلی گئی اور ایک کلرک سے نہایت بے تکلفی سے باتیں کرنے لگی۔ اب میں اپنی ضرورت کو بھول کر اس کے رویے پر غور کرنے لگا۔

اس کا نام پروین تھا اور وہ دو تین برس قبل ہمارے پڑوس میں رہا کرتی تھی۔ اس کا شوہر ایک ریٹائرڈ فوجی تھا۔ اس نے اس فوجی سے اعلانیہ عشق کے نتیجے میں شادی کی تھی اور غالباً یہی وجہ تھی کہ عام طور پر لوگ اس کو اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتے تھے۔ لوگ اس کے بارے میں اکثر کچھ سے کچھ کہتے رہتے۔ جو کسی فرد کی کردار کشی کے لیے کافی ہوا کرتے ہیں۔ پھر اس کے گھر کی آزادانہ روش، گھر میں اس کے اور اس کے شوہر کے ملنے جلنے والوں کا آنا جانا، سب شک کی دیواریں اٹھاتی رہیں۔ روایت کے پابند اور خود کو شریف سمجھنے والے لوگ ظاہر داری تو ضرور برتتے لیکن اس کی غیر موجودگی میں اس کی شکایت کرنے سے بھی نہیں چوکتے۔ اس کی نسبت طنز و تحقیر کا رویہ اپناتے۔ لیکن وہ ایک دلیر عورت تھی۔ اس نے اپنی روش میں کوئی تبدیلی نہیں لائی۔ شاید اُسے اپنے درست ہونے کا مستحکم یقین تھا۔

یہ ان دنوں کی بات ہے کہ جب ہم لوگ پڑوسی بن کر رہ رہے تھے تو ایک دن وہ ہمارے یہاں

آئی۔ میری بیوی نے بھی احتیاطی اقدام لے کر اس سے بات چیت کی۔ پروین کو جب علم ہوا کہ میں ایک کالج میں پڑھاتا ہوں تو وہ بہت خوش ہوئی۔ اس نے مجھ سے پوچھا۔ ''کیا آپ مجھے انگریزی پڑھنا لکھنا سکھا دیں گے۔ میں تو صرف اردو اور ہندی جانتی ہوں۔'' اس میں علم کی طلب دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی اور میں نے اسے انگریزی پڑھانے کی ہامی بھر لی۔ میری بیوی ہم دونوں کی باتوں کو ناگواری سے سن رہی تھی۔ اس نے مجھے تیکھی نگاہوں سے بھی دیکھا۔ میں نے اس کے تیور کو بھانپ لیا اور قیاس ہے کہ پروین کو بھی یہ بات سمجھ میں آ گئی تھی۔ لہٰذا اس نے پھر کبھی مجھ سے پڑھنے لکھنے کی کوئی بات نہیں کی۔

اسی طرح وقت گزرتا رہا۔ پروین کا میرے یہاں آنا جانا گاہے گاہے ہوتا رہا۔ اسی دوران اس کا اپنے مکان مالک سے کچھ جھگڑا ہو گیا۔ زیادتی مکان مالک کی تھی۔ لیکن سماج میں اس کی زیادتی نہیں مانی گئی۔ یہ بھی ایک چلن ہے کہ مکان مالک کرایہ داروں کو اپنی رعیت تصور کرتا ہے۔ جب تک دونوں میں دوستی رہتی ہے، اس کے ساتھ دانت کاٹی روٹی کھاتا ہے اور کسی وجہ سے ناگواری پیدا ہو جاتی ہے تو اسے فوراً اپنے مکان سے نکال باہر کر دینا چاہتا ہے۔ پروین کے مکان مالک کو بھی اس کی کوئی بات پسند نہیں آئی یا کوئی مفاد سامنے آ گیا اور وہ اس کو گھر سے نکالنے پر آمادہ ہو گیا۔ اس کے لیے اس نے پاس پڑوس کے لوگوں میں پروین کے خلاف ایک ماحول تیار کیا۔ محلے والوں کو ملایا۔ مقامی معاملات میں حصہ لینے والے فعال لوگوں کا تعاون حاصل کیا اور ہر جانب پروین کے خلاف تہمت اور الزام تراشی کی باتیں کرنے لگا۔ پروین بھی ضدی اور اڑیل تھی۔ وہ مردانہ وار انداز میں اپنی جگہ قائم رہی۔ تب مکان مالک نے پولس کی مدد لی اور مقامی تھانے میں محلے کی سلامتی، امن وآشتی وغیرہ کو محفوظ رکھنے کے لیے ایک درخواست پیش کی۔ اس درخواست پر محلے کے لوگوں نے دستخط کیے۔ گو کہ میں بھی اس وقت کرایے کے مکان میں رہا کرتا تھا اور اس وقت تک میرے اپنے مکان مالک سے میرے تعلقات استوار تھے۔ اس لیے بغیر

سوچے سمجھے میں نے بھی درخواست پر اپنا دستخط ثبت کردیا۔ پروین کو جب میری پیش رفت کا علم ہوا تو وہ شام کے وقت میرے گھر آئی۔ اُس وقت میرے گھر کے افراد کسی رشتے دار کے یہاں گئے ہوئے تھے۔ میں تنہا کتب بینی میں مشغول تھا۔ پروین کو دیکھ کر مجھے پشیمانی کا احساس ہوا اور میں سمجھ گیا کہ پروین کیوں آئی ہے۔ پھر بھی تنہائی میں اس کا آنا اچھا لگا کہ آج کھل کر باتیں ہوں گی۔ وہ بھی مجھ سے قریب کے صوفے پر بیٹھ گئی۔ چند لمحے ہم لوگ خاموش رہے۔ پھر اس نے ہی خاموشی توڑی اور ساتھ ہی رونے بھی لگی۔ وہ زار و قطار رو رہی تھی۔ روتے روتے اس کی ہچکیاں بندھ گئیں اور ایسا لگ رہا تھا کہ ایک سمندر اس کے دل میں اُمڈ آیا ہے اور ایک ندی سی اس کی آنکھوں میں بچھ گئی ہے۔ آنسوؤں کی ٹپ ٹپ اور ہچکیوں کے درمیان اس کی جو آواز ابھر رہی تھی، وہ ایک آہ تھی، ایک خاموش فریاد تھی۔ وہ کہہ رہی تھی۔ ''آپ نے بھی دستخط کردیا میرے خلاف۔'' اس وقت مجھے لگا کہ میں بھی شیکسپیئر کے ڈرامے کا کردار بروٹس بن گیا ہوں، جس کی دوستی پر سیزر کو ناز تھا۔ مگر تمام باغیوں کے ساتھ مل کر بروٹس نے بھی سیزر کے پیٹ میں چھرا گھونپ دیا تھا۔ پھر نہ جانے وہ کیا کیا بولتی رہی اور میں اس کی باتیں سنتا رہا اور شرمندگی کے احساس سے چور چور ہوتا رہا۔ اس روز پروین شاید نہ اٹھنے کے انداز میں دیر تک بیٹھی رہ جاتی۔ لیکن میرے بیوی بچوں کے آنے کا وقت ہو رہا تھا۔ اس لیے کسی غلط فہمی کو جگہ دینے سے بچنے کے لیے میں اس کو کسی طرح سمجھا بجھا کر رخصت کرنے میں کامیاب ہوگیا۔

پروین اب کسی اور محلے میں رہنے لگی تھی۔ لیکن وقفے وقفے سے میرے یہاں آتی جاتی اور اپنے سینے کا بوجھ ہلکا کر جاتی۔ کبھی کبھی بازار میں چلتے ہوئے بھی ملاقاتیں ہو جاتیں جہاں ہم لوگ رک کر چند باتیں کر لیتے۔ مجھے علم تھا کہ وہ اپنے موجودہ کرایے کے مکان میں کچھ زیادہ پریشان تھی اور شاید درخواست پر دستخط کردینے والے معاملے سے بھی اس کا دل میرے لیے صاف نہیں ہوا تھا۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود اس کی خوش طبعی اور وارفتگی میں ذرا بھی کمی نہیں آئی تھی۔ پتہ نہیں،

اس دوران پروین کو کہیں دیکھتا تو نہ جانے کیوں مجھے ایک خوب صورت پرندے کے ہاتھ سے چھوٹ جانے کا افسوس ہوتا۔ مرد کی جبلت میں یہ کمزوری داخل ہے کہ وہ بہت دنوں تک کسی جوان اور خوب صورت عورت سے محض خلوص اور شائستگی پر مبنی تعلق کو دوستی کا نام دے کر قائم نہیں رکھ سکتا ہے۔ بلکہ اس کے اندر کا چھپا شر ہمیشہ اس موقعے کی تلاش میں رہتا ہے کہ کب اور کس طرح اس عورت کا قرب حاصل کر کے گوہر مراد کو پایا جائے۔ چنانچہ اب ہوس اور گناہ کے جذبے مجھے بھی مضطرب کرنے لگے۔ انھیں حالات میں ایک روز پروین میرے یہاں آئی۔ وہ بہت مسرور تھی۔ وہ مجھے یہ خوش خبری دینے آئی تھی کہ آج اس نے زمین کا ایک چھوٹا سا ٹکڑہ خریدا ہے اور وہ جلد ہی اس پر اپنا ایک گھر بنا لے گی اور مکان مالکوں کی جانب سے پیش آنے والے جبر سے ہمیشہ کے لیے آزاد ہو جائے گی۔ میرے لیے بھی یہ خبر یک گونہ اطمینان بخش تھی کہ میں بھی برسوں کرایے کے مکان کی کرب ناکیوں کو جھیل چکا تھا اور اب میرا اپنا ایک چھوٹا سا مکان تھا۔ جہاں سکون و راحت کی چھت کے نیچے میری زندگی کے شب و روز گزر رہے تھے۔ لیکن میں اس وقت پروین کی خوشی میں اس طرح شریک نہیں ہو سکا جس طرح کہ مجھے ہونا چاہیے تھا بلکہ بات کچھ دوسری ہو گئی۔

اتفاق سے میں اس روز بھی تنہا تھا۔ میرے گھر کے تمام افراد کہیں گئے ہوئے تھے۔ میں نے اس موقعے کو غنیمت جانا اور پروین کو اپنے پاس بٹھایا۔ اس سے خوش کرنے والی باتیں کیں۔ لیکن تمام باتیں بالکل بے مزہ ہو رہی تھیں۔ اس لیے کہ میرے ذہن میں تو شاطر افعی رینگ رہا تھا اور میری آنکھوں میں سرخ ڈورے پڑ رہے تھے۔ میں بے قابو ہو رہا تھا۔ یہاں تک کہ میں نے اپنے ہاتھ کو سرکا کر پروین کے شانے پر پھیلا دیا۔ پروین کے لیے میری یہ حرکت بالکل غیر متوقع تھی۔ اس حرکت کو اس نے انتہائی ناپسندیدہ محسوس کیا۔ وہ ہنستے ہنستے سنجیدہ ہو گئی اور بولتے بولتے خاموش ہو گئی۔ جیسے اچانک فیوز اڑ گیا ہو اور تمام برقی قمقمے بجھ گئے ہوں۔ پھر لمحہ بھر بھی اس نے دیر نہیں کی۔ فوراً اٹھ کھڑی ہوئی اور سیدھے دروازے کی طرف لپکی۔ میرے ہوش و حواس بگڑ گئے تھے اور

میں پروین کو فقط باہر نکلتے دیکھ سکا تھا۔

میں ماضی کی باتوں میں الجھا ہوا تھا۔ ڈاک ٹکٹ، پوسٹ آفس کی بھیڑ اور میری عجلت...... سب ذہن سے رفع ہو چکے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد پروین کاندھے سے، پرس لٹکائے، انتہائی خوداعتمادی کے ساتھ کسی سے باتیں کرتی ہوئی باہر نکلی۔ میں اس کے بالکل سامنے کھڑا تھا۔ مجھے توقع تھی کہ جو کچھ ہوا وہ ماضی کی ایک بھول تھی اور وہ اسے فراموش کر کے مجھ سے مخاطب ہو لے گی۔ لیکن اس نے تو مجھے دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا اور میرے وجود کا کوئی نوٹس لیے بغیر میرے سامنے سے گزر گئی۔

میں اس کے جانے کے بعد بھی، اسی جگہ کچھ دیر ساکت کھڑا اپنی سطح کو ناپتا رہا۔

نزع کے عالم میں

ابھی وہ بازار میں ہے۔ دفتر کے بعد بازار جانا اس کا معمول ہو گیا ہے۔ آج اسے کئی چیزیں خریدنی ہیں اور تفریح بھی ایک ضمنی مقصد ہے۔ پہلے وہ گھنٹوں گھوما کرتا تھا۔ کبھی بازار میں، کبھی قلعے کی سڑکوں پر اور کبھی وہ چلتا چلتا گنگا کے کنارے پہنچ جایا کرتا تھا۔ اس طرح کی سیر سے اسے ایک قسم کی طمانیت ملتی۔ دوست کہتے ''تم بہت گھومتے ہو۔'' وہ ہنس کر کہتا۔ ''ہاں اس میں مجھے بڑا مزہ آتا ہے۔'' وہ اکثر اپنے ایک دوست کا پر لطف انداز میں ذکر کرتا جو اس کے ساتھ ایک بار پوری گیا ہوا تھا۔ وہاں اس کا دوست گھنٹوں سمندر کے کنارے بیٹھا رہ گیا تھا مگر اس نے سمندر کے پانی کو چھوا تک نہیں تھا۔ جب کہ وہ بہت دیر تک سمندر کی آتی جاتی لہروں سے الجھا تھا اور بہت دور تک سمندر کی ٹھنڈی اور گیلی ریت پر ننگے پاؤں چلتا رہا تھا۔ اس نے اس طرح کے سفر میں بہت کچھ پایا بھی ہے۔ طرح طرح کے مناظر اور مختلف قسم کے لوگ اس کی آنکھوں کے کیمرے میں آتے رہے ہیں۔ لیکن اب اس کے قویٰ کمزور ہوتے جا رہے ہیں۔ گھریلو ذمہ داریوں میں بھی اضافہ ہو گیا ہے۔ اب وہ قبل کی طرح تجرباتی سفر کے لیے وقت نکال نہیں پاتا ہے۔ دفتر سے آنے کے بعد کبھی کبھی تو اتنا تھک جاتا ہے کہ اس میں دوبارہ گھر سے باہر نکلنے کی سکت باقی نہیں بچتی ہے۔ ماحول کا حبس، سماجی بحران اور روز افزوں مسائل میں بھی ہر طرف یوں اضافہ ہوتا جا رہا ہے کہ لوگوں کے لیے زیادہ ملنا جلنا ایک دشوار گزار مرحلہ بن گیا ہے۔ اس لیے اب وہ اکثر شام کی تفریح یا پاس پڑوس میں جا کر بیٹھنا ملتوی کر دیتا ہے۔ لیکن ایسا کرنے سے دو تین دنوں کے بعد اس کی طبیعت بوجھل ہو جاتی ہے۔ بیوی اس کی کیفیت کو محسوس کر لیتی ہے اور کہتی ہے۔ ''جائیے کہیں گھوم آیئے ورنہ بیمار

پڑ جائے گا اور واقعی جب وہ ایک آدھ گھنٹہ کہیں سے چل پھر کر آتا ہے تو اس کی طبعیت میں تازگی آجاتی ہے۔

ابھی وہ بازار سے ہو کر آیا ہے۔ اس کی طبعیت بحال ہے۔ وہ ٹیلی ویژن کے سامنے بیٹھ گیا ہے۔ ٹیلی ویژن کے چھوٹے پردے پر چند اشتہاروں کے بعد خبروں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ خبریں سن کر وہ افسردہ ہو جاتا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد خود کو نارمل کرنے کے لیے سوچنے لگتا ہے۔ کل اتوار کا دن ہے۔ دن بھر بہت ساری مصروفیتیں ہیں۔ سویرے اسے ایک دوست کے یہاں جانا ہے۔ وہ اس کا بہت عزیز دوست ہے۔ یوں وہ عمر کی جس منزل میں ہے، اس میں کسی سے دوستی نبھانے کا جذبہ باقی نہیں بچتا ہے۔ پتہ نہیں یہ پژمردگی دبے پاؤں کہاں سے آجاتی ہے۔ جو ہمہ وقت آس پاس کے ماحول میں ایک قسم کی افسردگی اور سرد مہری پیدا کر دیتی ہے۔ کیا زندگی کے باقی دن یوں ہی بے کیفی اور آزردگی میں گزر جائیں گے؟ اسے کل سہ پہر میں کچھ خریداری کرنی ہے۔ گذشتہ چند دنوں سے وہ بیوی بچوں کی ضرورتوں کو ٹالتا آرہا ہے۔ اصل میں اسے دفتری کاموں سے فرصت نہیں مل رہی ہے۔ مارچ کا مہینہ ہے۔ آفس کے حساب کتاب کو مکمل کرنا ہے۔ ہیڈ آفس سے کچھ مزید کام آگئے ہیں۔ بیوی کا روزانہ اصرار ہوتا ہے کہ اسے کچھ کپڑے خریدنے ہیں۔ بچوں کی فرمائشیں بھی ہیں۔ پھر وہ اپنے لیے بھی چند چیزیں خریدنا چاہتا ہے۔ اسے اپنی بیٹی کے یوم پیدائش کے لیے تحفے اور ناشتے وغیرہ کا سامان بھی مہیا کرنا ہے۔ اس کی بیٹی آج بہت پر اشتیاق ہے۔ اسے بار بار یاد دلا رہی ہے کہ ''پاپا! کل آپ کو کہیں نہیں جانا ہے۔ کل میری سال گرہ ہے۔'' وہ کل دن بھر تو گھر میں نہیں رہ پائے گا کہ اسے ہفتے میں ایک دن عافیت اور سکون کا حاصل ہوتا ہے اور اس روز وہ اپنے ہفتہ بھر سے رکے کاموں کو انجام دیتا ہے۔ اس کی ملازمت ہی کچھ اس قسم کی ہے کہ روزانہ دس بجے دن سے پانچ بجے شام تک کے اوقات دفتر کی نذر ہو جاتے

ہیں۔ اس لیے اتوار یا فرصت کا کوئی دن اسے بے آب و گیاہ ریگستان میں ایک آس بھرے نخلستان کی طرح نظر آتا ہے۔ بہر حال بیٹی کی سال گرہ اس کے لیے کل کی سب سے اہم مشغولیت ہے۔ بیٹی کو وہ بہت پیار کرتا ہے۔ اسے یہ احساس نہیں ہونے دیتا ہے کہ وہ کسی بیٹے سے کم ہے۔ مگر وہ اکثر کہہ بیٹھتی ہے۔ ''پاپا! آپ لوگ جاوید کو زیادہ پیار کرتے ہیں۔'' وہ اسے سمجھاتا ہے۔ ''نہیں شگفتہ! ایسی بات نہیں ہے۔ ماں باپ کے لیے بیٹا بیٹی، دونوں برابر ہیں۔'' اسے یاد آتا ہے کہ جب اس کی بیٹی چھوٹی تھی تب وہ اس کے کاندھوں پر چڑھ جایا کرتی تھی اور اس کے سینے پر آکر بیٹھتی تھی۔ اس وقت اسے محسوس ہوتا تھا کہ وہ ایک پیڑ ہے اور اس کی بیٹی ایک ننھی سی چڑیا ہے۔

عین اسی وقت بجلی گل ہو جاتی ہے۔ وہ کمرے سے باہر چلا آتا ہے۔ گرمی بہت ہے۔ نیچے اسے حبس معلوم ہو رہا ہے۔ وہ اوپر کھلی چھت پر چلا گیا ہے۔ گھر کے بقیہ افراد نیچے ہی رہ گئے ہیں۔ وہ چھت پر چارپائی پر بیٹھ جاتا ہے اور پھر وہیں بیٹھے بیٹھے رات کے کھانے سے فارغ ہوتا ہے۔ بیوی بھی اس کے پاس آکر بیٹھ گئی ہے اور تھوڑی دیر تک کل کے کاموں کا ذکر کر کے کسی تھکے مزدور کی طرح سونے کے لیے چلی گئی ہے۔ لیکن وہ اوپر کی چھت ہی پر بیٹھا رہ گیا ہے۔ رات کافی گزر چکی ہے۔ گھر کے لوگ سو گئے ہیں۔ پڑوسیوں کے گھر کے دروازے بند ہو چکے ہیں۔ لوگوں کی آمد و رفت بھی موقوف ہو چکی ہے۔ لیکن اس کی آنکھوں میں نیند نہیں ہے۔ نیند کا آنا بھی ایک طرفہ تماشا ہے۔ بہت خوشی یا بہت پریشانی کے عالم میں نیند کی رانی روٹھ جاتی ہے۔ جب ہزار چاہنے کے بعد نیند نہیں آتی ہے تو آدمی خود کو بستر پر کیلوں سے گاڑتا ہے اور ڈھونڈتا ہے ماضی کے دریچوں میں کوئی خوب صورت لمحہ۔ کسی سفر میں کسی ملاقات میں، کسی آوارگی میں پیش آئی خوشی کی گھڑی۔ تب جا کر ٹپکتی ہے نیند آنکھوں میں۔

وہ چارپائی پر لیٹ گیا ہے۔ اس نے روشن آسمان کو دیکھا ہے۔ جھلملاتے ستاروں میں الجھا ہے۔

اسے رات نصف پہر کے بعد بہت پیاری معلوم ہوتی ہے ۔ جب سب سو چکے ہوتے ہیں اور سڑکوں پر کھڑے بجلی کے کھمبے آپس میں سرگوشیاں سی کرتے نظر آتے ہیں ۔شبنم کی پھوار برسنے کی آواز صاف سنائی پڑتی ہے ۔ اسے محسوس ہوتا ہے کہ اس وقت تنہا رات بہت مہربان اور شفیق ہو جاتی ہے۔ اسے احساس ہوتا ہے کہ اس وقت رات اس کو اپنا ہم راز بنا لیتی ہے اور کسی مونس اور غم خوار کی طرح دیر تک اس سے باتیں کرتی رہتی ہے۔ وہ رات کی رعنائیوں سے لطف اندوز ہوتا رہتا ہے کہ پتہ نہیں کس وقت اسے نیند محسوس ہونے لگتی ہے ۔وہ کسی طرح چھت سے نیچے اترتا ہے اور اپنے بستر تک پہنچتا ہے ۔بجلی آ چکی ہے ۔ پنکھے کی آواز سے کمرے میں بارش کے ہونے کا گمان ہوتا ہے ۔وہ بستر پر گر جاتا ہے اور فوراً ہی محو خواب ہو جاتا ہے ۔

سویرے وہ ذرا دیر سے جاگتا ہے ۔تقاضوں سے فارغ ہو کر بیوی بچوں کے ساتھ ناشتہ کرتا ہے ۔ آج سب مسرور ہیں اور کھانے کی میز پر چہک رہے ہیں ۔ جیسے کوئی تہوار کا دن ہو ۔ سہ پہر کو ان لوگوں کو خریداری کے لیے جانا ہے ۔شام کے وقت شگفتہ کے یوم پیدائش کی تقریب ہے ۔اس نے اپنی سہیلیوں کو بھی مدعو کر لیا ہے ۔ نئے کپڑے ، کیک ، پارٹی اور طرح طرح کے تحفے اس کی آنکھوں میں رقص کر رہے ہیں ۔بچوں کے ساتھ بازار جانے کے لیے آج وہ کچھ اچھے کپڑے پہنتا ہے ۔وہ سب سے قبل اپنے ایک دوست کے یہاں جانا چاہتا ہے ۔ایک دو گھنٹے کی تفریح کے بعد واپس آ کر پھر سہ پہر کے وقت خریداری کے لیے نکلنے والا ہے ۔ایک گلی سے دوسری گلی ، دوسری گلی سے تیسری گلی ہو کر وہ چوک بازار میں داخل ہوتا ہے ۔ یہاں سے تھوڑی دور پر اس کے دوست کا مکان ہے ۔لیکن چوک بازار میں اُسے ایک عجیب سی سرگرمی نظر آتی ہے ۔شاید یہاں کوئی تنازعہ اٹھ کھڑا ہوا ہے ۔ پھر ہنگامہ اور نعرے بازی کا آغاز ہوتا ہے ۔ پتہ نہیں کس جانب سے ایک مشتعل ہجوم آتا ہے اور بازار کی چند مخصوص دکانوں میں آتش زنی شروع ہو جاتی ہے ۔شور وغل ، مار پیٹ اور دھوئیں کے اُٹھتے مرغولوں کے درمیان بازار میں بھگدڑ مچ جاتی ہے ۔لوگ گرتے پڑتے اپنے

اپنے گھروں کی طرف روانہ ہوتے ہیں۔ کسی طرح وہ بھی اپنے محلے پہنچتا ہے۔ چوک بازار میں ہورہے ہنگامے کی خبر اس علاقے میں پھیل چکی ہے اور یہاں کی فضا بھی بوجھل ہو چکی ہے۔ ٹولیوں میں جمع ہو کر لوگ سرگوشیوں میں باتیں کررہے ہیں۔ وہ سیدھے اپنے گھر کی طرف لپکتا ہے۔ بیوی دروازہ کھولتی ہے۔ وہ اندر داخل ہو کر پاس پڑی کرسی پر بیٹھ جاتا ہے۔ وہ بالکل تھک چکا ہے۔ اس کی سانسیں تیز چل رہی ہیں۔ بیوی روہانسی ہو کر کہتی ہے۔ ''خدا کا شکر ہے، آپ خیریت سے واپس آگئے۔'' شگفتہ کہتی ہے۔ ''پاپا! ہم لوگ آپ کے لیے پریشان ہو گئے تھے۔'' معصوم جاوید کو الفاظ نہیں مل رہے ہیں۔ وہ پریشان حال باپ کی گود میں آکر بیٹھ جاتا ہے۔

شہر کے مختلف حصوں سے بم کے دھماکوں کی آواز آنے لگتی ہے۔ لگتا ہے کوئی عفریت پورے شہر کا تعاقب کررہا ہے اور اُسے اپنی گرفت میں لینا چاہتا ہے۔ باہر کے بڑھتے شور سے اس کے اندر کا سناٹا پھیلتا جارہا ہے۔ وہ سوچنے لگتا ہے کہ پورا معاشرہ جاں کنی کے عالم میں ہے اور اس وقت اپنے خواب وخیال کے مطابق زندگی بسر کرنا کتنا مشکل کام ہے۔ وہ اپنے بچوں کی طرف نظر ڈالتا ہے۔ سب کے حواس منتشر ہیں۔ ان کی آنکھوں میں اب یوم پیدائش کی تقریب کا عکس دور دور تک نظر نہیں آرہا ہے۔ بلکہ خوف وہراس کی پرچھائیاں صاف دکھائی پڑرہی ہیں۔

پذیرائی

دوپہر کا وقت تھا۔ اختر حسین اپنی کھپریل والی باہری بیٹھک میں تنہا بیٹھے ہوئے تھے کہ اُسی وقت ڈاکیا آیا اور انھیں ایک لفافہ دے گیا۔ انھوں نے لفافے کو چاک کر کے اس میں سے خط نکالا اور اسے پڑھنا چاہا۔ لیکن اس وقت چشمہ ان کے پاس نہیں تھا اور اب چشمے کے بغیر ایک لفظ بھی پڑھ پانا ان کے لیے مشکل ہو چکا تھا۔ لہٰذا انھوں نے اپنے بیٹے کو آواز دی اور اسے خط پڑھنے کو کہا۔ بیٹے نے خط پڑھا اور ان سے گویا ہوا۔ ابا یہ خط کلکٹر صاحب کے یہاں سے آیا ہے۔ یوم آزادی کے موقعے پر ضلعی ہیڈ کوارٹر میں کھیل کود کا خاص پروگرام ہے جس میں ضلعے کے پرانے کھلاڑیوں کی پذیرائی کی جائے گی اور اس کے لیے آپ کو بھی منتخب کیا گیا ہے۔ اختر حسین نے خط کو لفافے کے اندر رکھا اور کچھ سوچنے لگے۔ انھوں نے سوچا کہ وہ اس خبر کو اپنی بیوی کو سنائیں اور یہ سرکاری خط ان کو دکھائیں کہ اختر حسین بالکل ختم نہیں ہوا ہے بلکہ وہ اب بھی کسی نہ کسی درجے میں توقیر کی شے ہے۔ یہ سوچتے ہوئے وہ اٹھے اور بیوی کو آواز دیتے ہوئے اندر داخل ہوئے۔

ان کی بیوی کمرے میں لیٹی ہوئی تھیں۔ اختر حسین کی آواز سن کر اٹھ بیٹھیں۔ اختر حسین وہیں بیٹھ گئے اور اپنی سانسوں پر قابو پا کر انھوں نے اپنی بیوی کو ساری باتیں بتائیں۔ بیوی کی آنکھوں میں خوشی کی چمک دوڑ گئی۔ انھوں نے غیر اختیاری طور پر لفافہ لے کر خط نکالا اور اسے نہیں پڑھ سکنے کے باوجود الٹ پلٹ کر دیکھتی رہیں۔ چند لمحوں کے بعد انھوں نے کہا: ''بڑی خوشی کی بات ہے۔ اس وقت اسی بہانے کچھ پیسے سرکار سے مل جائیں تو کچھ مشکلیں آسان ہوں۔'' کچھ ایسی ہی توقع بیٹے نے بھی باندھ رکھی تھی۔ اختر حسین اس سوال کو ٹال گئے۔ ان کی نگاہیں الماری میں رکھے

ہوئے کپ، ٹرافی اور سرٹی فکٹ وغیرہ پر مرکوز ہوگئی تھیں اور ان کا ذہن مختلف نشیب وفراز میں بھٹکنے لگا تھا۔

اختر حسین بچپن ہی سے فٹ بال کھیلنے کے شوقین تھے۔ جب ان کے پاس گیند نہیں تھی تو وہ کپڑے کی گیند بنا کر گھر کے آنگن اور برآمدے میں کھیلا کرتے تھے۔ پھر جب ربڑ کی گیند انھیں حاصل ہوئی تو انھوں نے گھر کے باہر میدان میں کھیلنا شروع کر دیا تھا۔ وہ اس وقت بھی اپنی عمر کے تمام کھلاڑیوں پر سبقت لے جایا کرتے تھے۔ جب وہ اسکول میں داخل ہوئے تو اسکول کے میدان میں باضابطہ چمڑے کی بڑی گیند سے کھیلنے لگے تھے۔ اس کھیل میں ان کے نام کی اس وقت خوب ستائش ہوئی تھی۔ جب انھوں نے اسکول کے ایک اہم میچ میں ذاتی طور پر دو گول کر کے اپنے اسکول کو فتح دلائی تھی۔ میچ کے ختم ہوتے ہی ان کے ساتھیوں نے انھیں کاندھے پر اٹھالیا تھا اور اختر حسین زندہ باد! اختر حسین زندہ باد!! کے نعروں سے پورا میدان گونج اٹھا تھا۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نے بھی بڑھ کر اُسے چوم لیا تھا اور خوشی کے عالم میں اپنی جیب سے قلم نکال کر انھیں بطور انعام پیش کیا تھا۔ اس روز کے بعد سے کھیل کے میدان میں ان کی زندگی کے جس نئے سفر کا آغاز ہوا وہ برسوں تک جاری رہا اور اگر گھریلو حالات بالکل ناموافق نہیں ہو جاتے تو وہ اور بھی آگے کی منزل کو جاتے اور مزید کامیابیوں کو سر کرتے۔ میٹریکولیشن کے بعد انھوں نے کئی برسوں تک کالج کی ٹیم میں کھیلا تھا۔ اس کے علاوہ وہ ضلعے کی ٹیموں میں بھی کھیلتے رہے تھے۔ وہ سینٹر فارورڈ کے برق رفتار کھلاڑی تھے۔ وہ اور ان کی گیند میں اتنا ربط و آہنگ تھا کہ ایسا معلوم ہوتا کہ دونوں ایک دوسرے کی زبان سمجھتے ہیں۔ وہ جب کھیل کے میدان میں ہوتے اور مخالف کھلاڑیوں کو زک دیتے تو رقص اور ساحری کا سماں بندھ جاتا۔ تماشیوں کی نظریں ہر لمحہ ان پر مرکوز رہتیں اور جب وہ گیند لے کر مخالف ٹیم کے گول پوسٹ کی طرف بڑھتے تو فضا میں ہر طرف اختر حسین! اختر حسین!! کا شور بلند ہو جاتا۔ اس وقت تمام قلوب

بالکل ساکت ہو جاتے اور ایسا لگتا کہ سب کے دل کی دھڑکنیں رک گئی ہیں اور پھر منٹوں میں گیند کو نہایت فن کارانہ انداز میں جال میں ڈال آتے۔ یہ لمحے اختر حسین کے لیے بھی بڑے یادگار ہوا کرتے تھے۔

اختر حسین دیوار سے لگ کر سنہری یادوں کے اوراق پلٹتے رہے۔ انھیں اچھی طرح یاد تھا کہ ایک دو بار نہیں، بلکہ بہتوں بار انھوں نے اپنی ٹیم کو انتہائی مشکل حالات میں کامیابی سے ہم کنار کیا تھا اور اپنے مداحوں کے ڈوبتے دلوں میں اچانک خوشی اور جوش بھر دیا تھا۔ کھلاڑی ہار کر روتے ہیں اور کبھی کبھی غیر متوقع فتح پا کر بھی ان کی آنکھیں نم ناک ہو جایا کرتی ہیں۔ ایسے موقعوں پر خوشی کے آنسو اختر حسین کی آنکھوں میں بھی آ جایا کرتے تھے۔ ان کی یادوں کا سلسلہ اس وقت منقطع ہوا جب ان کی بیوی نے انھیں مخاطب کیا۔ ''کھانا نہیں کھائیں گے کیا؟ یا ابھی ہی سے تقریب میں جانے کی تیاری میں لگ گئے ہیں!'' اختر حسین نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ افلاس زدہ ماحول کی ایسی طنزیہ گفتگو کے وہ برسوں قبل ہی سے عادی تھے۔ بدقسمتی سے وہ بھی ایک ایسے گھر کے فرد تھے جہاں ہمیشہ طنز کے تیر اور طعنوں کے کانٹوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ لہٰذا انھوں نے ایسے ماحول میں خاموش رہنے کی عادت بنالی تھی۔ کیونکہ اسی میں انھیں عافیت نظر آتی تھی۔ وہ کمرے سے باہر آئے۔ ہاتھ دھو کر کھانے کے لیے بیٹھ گئے۔ کھانا کھا کر کمرے میں بستر پر دراز ہو گئے۔ لیکن آنکھوں میں نیند کہاں؟ وہ اپنی نامرادی کی تاریک گلیوں میں کھوتے چلے گئے۔

اختر حسین کو یاد آیا کہ جب وہ بی۔ اے کے پہلے سال میں تھے تو ان کے والد کی ناگہانی موت ہو گئی تھی۔ وہ بھائی بہنوں میں سب سے بڑے تھے اور اس لیے اچانک اُن کے دوش پر گھر کی تمام ذمہ داریاں اس طرح آ پڑیں کہ نہ صرف ان سے کالج چھوٹا بلکہ ان کا پیارا فٹ بال بھی چھوٹ گیا تھا۔ کالج چھوڑ کر انھوں نے پہلے ملازمت تلاش کرنے کی کوشش کی لیکن جب کئی برسوں تک بھٹکنے

کے بعد انھیں ملازمت حاصل نہیں ہو سکی تو تھک ہار کر انھوں نے اپنی چند بیگہ زمین کی طرف نگاہ ڈالی اور قلم و کتاب سے نظر ہٹا کر ہل بیل کو تھام لیا۔ اختر حسین کو سب کچھ یاد تھا۔ وہ دن اور آج کا دن! انھوں نے شروع میں کھیتی باڑی کے کاموں کے ساتھ فٹ بال کے کھیل میں بھی دلچسپی لینی چاہی لیکن رفتہ رفتہ وہ گھریلو ذمہ داریوں میں اس طرح الجھ گئے جیسے کوئی مکھی تارِ عنکبوت میں الجھ جاتی ہے۔ انھیں پھر ذرا بھی ہوش نہیں رہا۔ انھوں نے بہنوں کی شادی کی۔ چھوٹے بھائیوں کے روزگار کی فکر کی۔ پھر اپنی شادی اور اپنے بچوں کے مسائل، غرضیکہ وہ دم بہ دم مسائل میں گھر کر جیتے جیتے بالکل زنگ خوردہ ہو چکے تھے۔ ان کا اپنا ان کے پاس کچھ بھی نہیں بچا تھا۔ جسم کے کس بل ٹوٹ چکے تھے۔ ان کا شوق بے زبان ہو گیا تھا۔ یا یوں کہیے کہ ان کی روح کا اُجالا ختم ہو گیا تھا۔ اب کہاں وہ کھیل کا میدان اور کہاں فٹ بال کی جادوگری، لوگوں کی تالیاں، پذیرائیاں، واہ! واہ!! کا شور اور انعامات کی بارش۔ سب کے سب خواب ہو چکے تھے۔ زندگی بھی کیا طرفہ تماشا ہے۔ کیسی کیسی حسرتیں وقت کی قربان گاہ میں دفن ہو جایا کرتی ہیں!

کلکٹر صاحب کے بلاوے پر جانے کا دن آتے آتے اختر حسین کا وقت انتہائی اضطراب میں گزرا۔ انتظار کی بے چینی انھیں مضطرب کیے ہوئے تھی۔ جس دن کہ انھیں جانا تھا اس دن وہ صبح ہی سے بہت مسرور تھے۔ نہا دھو کر انھوں نے کھانا کھایا۔ اپنے سب سے اچھے کپڑوں کو پہنا۔ بال سنوارے۔ خوش بو لگائی اور تب شہر کے لیے روانہ ہوئے۔ شہر کے سب سے بڑے میدان میں دوپہر ہی سے مختلف کھیلوں کا آغاز ہو چکا تھا۔ کھیل کے اختتام کے بعد شہر کے عمائدین اور اعلیٰ عہدے داروں کی موجودگی میں تقسیم اسناد و انعامات کی تقریب شروع ہوئی۔ معزز مہمانوں اور ممتاز پرانے کھلاڑیوں کو پھولوں کے ہار پہنائے گئے۔ اختر حسین کی زندگی میں اس طرح کے لمحے پہلی بار نہیں آئے تھے، بلکہ وہ اپنے عروج کے دنوں میں بھی کئی بار انعامات سے نوازے جا چکے تھے۔ لیکن اب یہ پذیرائی انھیں بالکل عجیب لگ رہی تھی۔ برسوں کی تھکا دینے والی زندگی اور طرح طرح کی

شکست وریخت کے سبب ان کا اعتماد ان کی اپنی ذات پر سے ختم ہو چکا تھا۔ زمانے کی ناشناسی اور ناقدری نے انھیں کہیں کا نہ رکھا تھا۔ اس لیے انھیں یہ سب کچھ نیا لگ رہا تھا۔ زندگی میں پہلی بار انجام پاتا ہوا۔ انھوں نے اسٹیج پر بیٹھے بیٹھے دلچسپی اور انہماک کے ساتھ پورے منظر کو دیکھا اور انبساط وراحت محسوس کیا۔ مہمانوں کی گل پوشی کے بعد تقریروں کا سلسلہ شروع ہوا۔ معزز مہمانوں نے موقعے کی مناسبت سے اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ سبھی مقررین نے پرانے کھلاڑیوں میں اختر حسین کا خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا۔ فخر کے ساتھ ان کے کھیل کے فن کارانہ جوہر کو یاد کیا اور سب لوگوں نے اعتراف کیا کہ اگر ان کے حالات ناسازگار نہیں ہو گئے ہوتے تو وہ یقیناً ملک کے مایہ ناز کھلاڑیوں میں ایک ہوتے۔

اختر حسین خوشی کے گھوڑے پر سوار، رنگین مناظر کی چمک دمک میں کھوئے ہوئے تھے کہ ان کے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ انھیں یاد آیا کہ سرکاری دعوت نامہ ملنے کے روز ہی سے ان کی بیوی اور ان کے بیٹے، نہ جانے کیا کیا آس لگائے بیٹھے ہیں۔ انھیں اپنی بیوی پر بہت ترس آیا کہ تنگ دستی میں گزر کرنے والی، یہ عورت کتنی قابل رحم ہے۔ تقسیم انعامات کے وقت سب سے پہلے اس روز کے کھیلوں میں حصہ لینے والے نوجوانوں کو نوازا گیا۔ خوب رو، تازہ دم لڑکے باری باری منچ پر آتے اور کلکٹر صاحب کے ہاتھوں انعام قبول کرتے۔ ان لڑکوں میں اختر حسین کو اپنی نوجوانی کی تصویر نظر آنے لگی۔ انھوں نے حسرت و پیار بھری نگاہوں سے انھیں دیکھا اور سوچنے لگے کہ آج یہ لڑکے جوان اور تازہ دم ہیں۔ ان کی سرگرمیاں میدان میں چھائی ہوئی ہیں۔ لیکن بہت جلد یہ لڑکے کہاں گم ہو جاتے ہیں؟ چند برسوں بعد پھر کہیں نظر نہیں آتے۔ نظر آتے بھی ہیں تو اداس، پریشان اور بالکل مرجھائے ہوئے سے۔ بے روزگاری اور زمانے کی ناقدری انھیں ڈس لیتی ہے۔ انھوں نے میدان کے چاروں طرف گل مہر کے پیڑوں کو دیکھا۔ یہ پیڑ ان کے پرانے آشنا اور رفیق تھے۔ یہ اب بھی جوان معلوم ہو رہے تھے۔ لال لال پھولوں کی فصلیں اب بھی آتی رہی

ہیں ان میں۔ اختر حسین نے کرب کے ساتھ اس سوال کو پھر دہرایا۔ کہاں چلے جاتے ہیں یہ لڑکے؟

اسی وقت ان کا نام پکارا گیا۔ ایک بار پھر اختر حسین کے کارناموں کا چرچا ہوا اور جب اختر حسین اپنی کرسی سے اٹھ کر کلکٹر صاحب کے پاس گئے تو ان کو ایک چمکتا ہوا خوب صورت کپ پیش کر دیا گیا۔ کلکٹر صاحب نے بڑھ کر خود ان سے مصافحہ کیا۔ تالیوں کی گڑگڑاہٹ سے حاضرین نے اختر حسین کا پر زور خیر مقدم کیا۔ اس وقت پورے میدان میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ لیکن اختر حسین، ان سب سے بے نیاز کسی اور فکر میں گم میلوں دور اپنے گاؤں پہنچ چکے تھے۔ جہاں ان کی بیوی تشنہ لب ضرورتوں کی فہرست لیے ان کے انتظار میں دروازے پر کھڑی تھیں۔

اختر حسین نے کسی طرح کپ قبول کیا اور کانپتے ہوئے قدموں سے پھر اپنی نشست پر آ کر بیٹھ گئے۔ پروگرام کے ختم ہونے کے بعد بھی وہ کچھ دیر تک وہیں بیٹھے رہ گئے تھے۔

روح کا زخم

ملازمت سے سبکدوش ہوئے اسے چار پانچ برس کا عرصہ گزر چکا تھا لیکن اس درمیان وہ کبھی اس شہر میں نہیں گیا تھا۔ وہ وہاں جانا بھی نہیں چاہتا تھا۔ اس شہر نے اس کے دل میں ایک ایسا کانٹا چبھو دیا تھا جو ہر وقت ٹیس پیدا کرتا تھا۔ لیکن اسے اپنی بیوی کے ساتھ ایک بار پھر وہاں جانے کے لیے مجبور ہونا پڑا۔ دراصل اس کالج کے جشن زریں کی تقریبات کا موقع تھا جس میں اس نے پینتیس سال درس وتدریس میں گزارے تھے۔ اسے کالج سے دعوت نامہ آیا تھا۔ پرنسپل نے بھی فون پر اسے شرکت کی دعوت دی تھی۔ انھوں نے کہا تھا: آپ کالج کے ہم نفس وہم نوا رہے ہیں۔ کالج کے جسم وجاں کا کون سا ایسا گوشہ ہے جس پر آپ کے وجود کا نقش موجود نہیں ہے۔ لہٰذا آپ ضرور شرکت فرمائیں اور اپنی محنت کے ثمر کو دیکھیں۔

پرنسپل کی باتوں سے وہ ماضی میں کھو گیا۔ پہلے اسے اپنی طالب علمی کا زمانہ یاد آیا اور تب کالج کی ملازمت کے دنوں کا۔ اتفاق سے وہ اسی کالج کا طالب علم بھی رہا تھا اور جب وہ طالب علم تھا تو اپنے اساتذہ سے اتنا متاثر ہوا تھا کہ وہ طالب علمی کے دنوں ہی میں درس وتدریس کے پیشے کا گرویدہ ہو گیا تھا۔ تعلیم کے شعبے سے اس کی دلچسپی انھیں دنوں پیدا ہوئی تھی۔ لہٰذا جب وہ تعطیل میں گھر جاتا تو گاؤں کے طلبہ کو مفت میں تعلیم دیا کرتا تھا۔ تعلیم مکمل ہونے کے بعد وہ لکچرار بننے کی خواہش کا اس قدر اسیر ہو گیا کہ اس نے کسی دوسری ملازمت کے لیے کہیں عرضی تک نہ دی۔ اس نے کئی برسوں تک بے روزگار رہنا منظور کیا لیکن لکچرار بننے کے اپنے عزم کو کمزور ہونے نہ دیا۔ اس کے حوصلے جوان رہے اور وہ کالج کی ملازمت کے لیے کوشش کرتا رہا۔ آخر ایک دن اسے یہ

ملازمت حاصل ہوگئی۔ جس روز وہ لکچرار بنا وہ دن اس کی زندگی کا ایک اہم اور یادگار دن تھا۔ اس روز اس کی خوشی کی انتہا نہ تھی۔

اس نے کالج کی ملازمت کو عبادت کی طرح برتا تھا۔ ملازمت اس کے لیے صرف گزر بسر کا ذریعہ ہی نہ تھی بلکہ باعث انبساطِ قلب بھی تھی۔ اس نے ملازمت کے ایام کو بھرپور طور پر جیا تھا۔ کالج کی سرگرمیوں مثلاً کالج گارڈن کی دیکھ ریکھ، کتب خانے کے انتظامی امور اسپورٹس، مباحثے اور سیمینار وغیرہ کو آرگنائز کرنے میں وہ خوب حصہ لیا کرتا تھا۔ کالج کی ملازمت میں ان دنوں تنخواہ زیادہ نہ تھی لہٰذا گزر بسر تنگ دستی میں ہوا کرتی تھی۔ پھر بھی اسے اپنی تہی دستی کا ذرا بھی احساس نہ رہتا اور وہ اپنے درس و تدریس کے کاموں میں مگن رہتا۔ جب وہ کالج کے لیے گھر سے نکلتا تو اس میں زبردست خود اعتمادی پیدا ہو جاتی اور وہ خود کو اس وقت مثل خسرو دوراں سمجھتا۔ پرنسپل کا فون آیا تو لگا کہ ماضی کے خوش گوار دنوں نے اس کی بوجھل اور پژمردہ زندگی کے بند دروازے پر ایک بار پھر دستک دی ہے۔ لیکن حالات سے مجبور ہو کر اس نے دستک کو ٹالنا چاہا۔ اس کا دل چاہا کہ وہ پرنسپل سے معذرت کر لے۔ لیکن پرنسپل کا اصرار اتنا شدید اور ملتجیانہ تھا کہ وہ انکار نہ کر سکا۔ چند سبکدوش ساتھیوں کا بھی فون آیا کہ چلو ہم لوگ اسی بہانے کالج کے در و دیوار کو ایک بار پھر دیکھ آئیں۔ جونیر ساتھیوں نے بھی گزارش کی تھی کہ تقریب کی کامیابی کے لیے آپ جیسے بزرگوں کی ضرورت ہے۔ لہٰذا ضرور تشریف لائیں۔

اس نے بیوی کو ساری باتیں بتائیں۔ وہ اس خبر سے مضمحل ہوگئی۔ وہ اس شہر کا ذکر بھی سننا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے بعد کے چند برس وہاں جس اذیت اور کرب ناکیوں میں گزارے تھے وہ اسے اچھی طرح یاد تھے۔ وہ ان تلخ یادوں کو کبھی فراموش نہیں کر سکتی تھی۔ لہٰذا بیوی نے کالج کی تقریبات میں شرکت کرنے سے اپنی معذرت کا اظہار کیا۔ وہ تنہا نہیں جا سکتا تھا اس لیے کہ اپنی بیمار بیوی کو

اکیلا چھوڑ کر کہیں جانا اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔ اس کی دیکھ بھال کرنے والا اس کے علاوہ کوئی دوسرا نہیں تھا۔ خاندان کے دیگر افراد دوسرے شہروں میں آباد تھے اور سب اپنے اپنے مسائل میں گرفتار تھے ۔ لہٰذا اس نے بیوی سے دوبارہ درخواست کی اور اسے سمجھایا کہ انسانی زندگی بہت صبر آزما مرحلہ ہے۔ اسے نہ تو اپنی مرضی سے جیا جا سکتا ہے اور نہ ہی اپنی مرضی سے اس سے نجات حاصل کی جا سکتی ہے۔ جب تک سانسوں کا رشتہ قائم ہے انسان کو زندگی کے تمام تقاضوں سے نبرد آزما ہونا پڑتا ہے۔ اس نے بیوی سے کہا: شاداں ہم لوگ ماضی کی رہ گذر سے روبرو ہونے کا حوصلہ کریں۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس شہر نے بہت سارے غم دیے ہیں۔ اس وجہ سے ہم لوگوں نے اس شہر کو چھوڑ دیا۔ نئی جگہ آ کر آباد ہوئے۔ شناسا چہرے اور مانوس ماحول سے خود کو علاحدہ کر لیا۔ لیکن یہ ایسا موقع ہے کہ میں انکار نہیں کر سکتا اس نے باتوں کو جاری رکھتے ہوئے کہا "تم جانتی ہو شاداں کہ میں نے کالج کے لیے کتنا کچھ کیا ہے۔ کالج کے جشن زریں کے موقعے پر وہاں بہت سارے سبکدوش اساتذہ جمع ہوں گے۔ ان سے ملاقات کا موقع ملے گا۔ اب زندگی بچی ہی کتنی ہے۔ بہت سارے پرانے طلبہ بھی آئیں گے جن کو ہم نے اپنوں کی طرح پڑھایا لکھایا۔ زندگی بسر کرنے کا طریقہ سکھایا۔ کتنی مسرت ہوگی انھیں دیکھ کر جو بالکل انکھوئے کی طرح ہمارے پاس آئے تھے اور ہمارے ہاتھوں تشکیل پا کر آج کارزار حیات میں کامیاب و کامراں ہیں۔" بیوی اس کی باتوں کو سنتی رہی۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کی خاموشی اس کی نیم رضامندی کے آثار پیدا کر رہی تھی۔

کالج کے جشن زریں کی تقریبات کا آغاز شان دار طریقے سے ہوا۔ تقریبات میں رنگا رنگ پروگرام تھے۔ کالج کی پچاس برس کی سرگرمیوں کو تصویروں کے ذریعہ ایک نمائش میں پیش کیا گیا تھا۔ ان میں یوم آزادی، یوم جمہوریہ، سالانہ اسپورٹس، کلچرل پروگرام، معروف شخصیتوں کی آمد اور سمینار وغیرہ کے موقعوں پر لی گئی تصویریں تھیں۔ اس نمائش گاہ میں وہ داخل ہوا۔ ساتھ میں اس کی

بیوی بھی تھی۔ اس نے پورے انہماک کے ساتھ ان تصویروں کو دیکھنا شروع کیا۔ کئی تصویروں میں وہ خود بھی موجود تھا۔ اس نے ان تصویروں میں اپنے جواں جسم اور سیاہ بالوں کو بار بار پرشوق نگاہوں سے دیکھا۔ لیکن وقت کے آئینے میں اب یہ چیزیں بالکل بدل چکی تھیں۔ چند برسوں قبل تک اس کی صحت کتنی اچھی تھی اور وہ کتنا وجیہہ نظر آتا تھا۔ لیکن اُف آج اس کا وجود ایک کھنڈر کی طرح تھا۔ اچانک اس کے قدم ٹھٹک گئے۔ ایک تصویر میں جو شاید یوم آزادی کے موقعے پر کی تھی پرچم کشائی کے وقت وہ ایک بچے کی اُنگلی پکڑے کھڑا تھا۔ تصویر دیکھتے ہی اس کے چہرے کی رمق ختم ہوگئی۔ وہ اس تصویر کو بغور دیکھنا چاہتا تھا لیکن اچانک اُسے خیال آیا کہ اس کی بیوی بھی اس کے ساتھ ہے۔ لہٰذا وہ آگے بڑھ گیا اور دوسری تصویروں کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

اس نے کالج کی عمارتوں کی بھی سیر کی۔ وہی شناسا در و دیوار تھے۔ وہی کلاس روم، وہی بنچ کرسیاں۔ کالج کے اندر کی روش کے کناروں پر ایستادہ پیڑ سرسبز و شاداب نظر آرہے تھے۔ ان پیڑوں کے نیچے وہ گھنٹوں بیٹھا کرتا تھا بلکہ وہ اس کی پسندیدہ جگہ تھی۔ اُس جگہ بیٹھ کر اُسے محسوس ہوتا تھا کہ اس کا باطنی رشتہ اب بھی اس کے گاؤں سے قائم ہے۔ جہاں بہت سارے پیڑ ہیں۔ چاروں طرف ہریالی وشادابی ہے۔ حالانکہ ملازمت کے بعد اس کا تعلق اس کے گاؤں سے کم ہوتا چلا گیا تھا۔ کالج کی عمارتوں میں وہ دیر تک کھویا رہا۔ عمارتوں میں کچھ اضافہ ہوا تھا۔ چند نئے شعبے تعمیر ہوئے تھے۔ تقریبات کے موقعے کے لحاظ سے ان پر رنگوں کی آمیزش کی گئی تھی۔ جس سے ان کی جاذبیت میں اضافہ ہو گیا تھا۔ رنگ برنگ کی جھنڈیوں سے کالج کو سجایا گیا تھا۔ خوب صورت مجلّے کی اشاعت ہوئی تھی۔ مجلّے کے ایک مضمون میں اس کو ایک عمدہ استاد اور ایک اچھے منتظم کار کی حیثیت سے یاد کیا گیا تھا۔ مضمون نگار نے اپنے مضمون میں اس کے متعلق لکھا تھا۔ ''پروفیسر جعفر عباس نے کالج کے کاموں سے محبت کی اور طالب علموں کی تعلیم وتربیت اور ان کی نشو ونما میں خود کو جیا۔'' اپنے متعلق اس عبارت کو پڑھ کر اس پر سرور کی کیفیت چھا گئی۔ اس کا غم

زدہ دل جان پا گیا۔ تبسم کی ایک لکیر اس کے لبوں پر رقص کرنے لگی۔ وہ تقریبات کی دیگر دلچسپیوں میں محو ہو گیا۔ اس نے اپنے پرانے ساتھیوں کو ڈھونڈا۔ ان سے گلے ملا۔ ہنسی مذاق کی باتیں ہوئیں۔ افراد خانہ کے احوال دریافت کیے گئے۔ کچھ گلے شکوے بھی ہوئے۔ وہ کئی پرانے طلبہ سے بھی روبرو ہوا۔ کسی کو اس نے پہچانا اور کسی کو نہیں پہچان سکا۔ کسی کا نام یاد رہا اور کسی کا فقط چہرہ۔ اپنے جن پرانے طلبہ کو وہ بھول چکا تھا ان سے دوبارہ مل کر وہ تذبذب کا شکار ہوا۔ بہت مشکل سے ذہن کے افق پر ان کے حلیے بنے اور یادداشت کے پردے پر ان کی یادیں تازہ ہوئیں۔ وہ دیر تک ماضی کی راہ گذر میں کھویا رہا۔

آخر میں وہ پنڈال میں بیٹھ کر لوگوں کی تقریریں سننے لگا۔ وہ تقریر سننے میں محو تھا کہ اس کی بغل میں بیٹھی ہوئی اس کی بیوی نے اس سے کہا:

''ادھر دیکھو! بائیں طرف اس پیڑ کے پاس۔''

اس نے ادھر نظر دوڑائی تو دیکھا کہ وہاں این سی سی کے چند کیڈٹ کھڑے ہیں۔ اُسے کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ اس کی بیوی اس سے کیا کہہ رہی ہے؟ اس نے بیوی سے دریافت کیا:

''تم کیا کہہ رہی ہو؟ وہاں تو این سی سی کے کیڈٹ کھڑے ہیں۔''

''ہاں وہ تو میں بھی دیکھ رہی ہوں۔ لیکن ان میں گھنگرالے بالوں والا وہ لڑکا'' اس نے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

اس نے ایک بار پھر نظر دوڑائی۔ وہ اپنی بیوی کا اشارہ سمجھ چکا تھا۔ بیوی کی آنکھیں نم تھیں۔ اس نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر اُسے تسلی دی۔ اسے معلوم تھا کہ اس کی بیوی کو اس شکل وصورت کا کوئی لڑکا نظر آ جاتا ہے تو وہ اُداس اور بے چین ہو جاتی ہے اور اس میں اپنی آرزوؤں کا بے مایہ عکس

ڈھونڈنے لگتی ہے۔ یہ بات وہ اپنی بیوی کے متعلق سوچ رہا تھا لیکن اس کے دل نے اس سے پوچھا کہ کیا وہ خود اس فکر سے آزاد ہے؟ کیا وہ بھی اس وقت ماضی کے بھنور میں اُلجھا ہوا نہیں ہے؟ اس نے خود کو سنبھالنا چاہا لیکن کسی پروگرام میں اس کا دل نہیں لگا اور رفتہ رفتہ اس کی طبیعت ڈوبنے لگی۔ اچانک وہ کھڑا ہو گیا اور اس نے بیوی سے مخاطب ہوا:

''چلو گھر چلیں۔''

''ہاں چلیے۔'' بیوی نے جواب دیا۔

دونوں پنڈال سے باہر نکلے۔ اس وقت تک اس کی طبیعت کی شادابی ختم ہو چکی تھی۔ وہ لوگوں کی نگاہوں سے بچتا ہوا پارکنگ کی جگہ پر پہنچا۔ اس کا ڈرائیور گاڑی کے پاس کھڑا تھا۔ دونوں گاڑی میں سوار ہوئے اور گاڑی منزل کی طرف روانہ ہوئی۔ آتے وقت اس نے کوئی دوسری راہ اختیار کی تھی۔ لیکن اس وقت وہ شہر سے ہو کر گزر رہا تھا۔ گاڑی کے شیشے سے جھانک کر وہ باہر کی طرف دیکھنے لگا۔ شہر کچھ زیادہ نہیں بدلا تھا۔ اُس کی بے چہرگی ہنوز قائم تھی۔ ہاں گرتے پڑتے دوڑتے بھاگتے لوگوں کی آبادی میں ضرور اضافہ ہو گیا تھا۔ اسے خیال آیا کہ ان دنوں شہر میں کس مافیا گروہ کا بول بالا ہے۔ وہ کون لوگ ہیں جو سڑکوں پر بے خوف ہو کر گولیاں چلاتے پھرتے ہیں۔ وہ ان خیالات میں الجھا ہوا تھا کہ اس کی گاڑی ایک چوک سے گزری۔ یہ چوک شہر کا سب سے بڑا اور مصروف ترین چوک تھا۔ چوک سے گزرتے ہی وہ ماضی کی یادوں میں کھو گیا۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ ایک رکشے پر سوار ہو کر گھر کی طرف جا رہا ہے۔ اس کی بغل میں اس کا بیٹا دلشاد بیٹھا ہوا ہے۔ اچانک کئی لوگ بندوقیں لیے ہوئے چوک میں وارد ہوتے ہیں اور ایک دوسرے پر گولیوں کی بوچھار کرتے ہیں۔ چوک میں بھگدڑ مچ جاتی ہے۔ وہ گھبرا جاتا ہے اور رکشے والے سے کہتا ہے کہ وہ سامنے والی گلی میں داخل ہو جائے کہ اسی وقت اچانک اس کا بیٹا لڑھک کر اس کی گود میں چلا آتا ہے۔ خون کی ایک تیز دھار بہتی

ہے۔اس کے بیٹے کا پورا جسم اور خود اس کے کپڑے خون میں لت پت ہو جاتے ہیں۔وہ چونک جاتا ہے۔تصورات کی ہول ناکیاں اسے بے چین کر دیتی ہیں۔عجب نہ کہ وہ چیخ پڑتا۔

یہ واقعہ تقریباً سات آٹھ برس پرانا ہے جو اسی چوک میں اس کے ساتھ پیش آیا تھا۔وہ بے پناہی اور بے بسی کے عالم میں اپنی اکلوتی اولاد کو موت کی لہروں میں ڈوبتا ہوا دیکھتا رہ گیا تھا۔اس واقعے نے اس کی اور اس کی بیوی کی روحوں میں اداسی اور غم ناکی کے گہرے زخم اُگا دیے تھے اور انھیں زندگی کی تازگی سے محروم کر دیا تھا۔اُسے اکثر محسوس ہوتا کہ اس کے سامنے خون کا ایک دریا بہہ رہا ہے جس میں گھنگرالے بالوں اور ابھرتے قد کا کم سن اور معصوم دلشاد ڈوب رہا ہے۔

دکانوں کے برقی قمقمے، بازار کی چہل پہل اور ماضی کی یادیں کرچیاں بن کر اُس کی آنکھوں میں چبھنے لگیں۔ بے چین اور پریشان ہو کر اس نے بیوی کی طرف دیکھا۔وہ گاڑی کی کھڑکی سے سر لگائے رو رہی تھی۔آنکھوں میں آنسو بھر اُٹھے تھے۔اس نے جیب سے رومال نکال کر بیوی کے آنسوؤں کو پونچھا۔اُسے ڈھارس دیا اور ڈرائیور سے کہا''گاڑی ذرا تیز چلاؤ۔''

سر سبز

ہمارے کالج کے احاطے میں ایک چھوٹا سا باغیچہ ہے جو ٹھیک دفتر کے سامنے واقع ہے۔اس کے چاروں طرف ایک کم اونچائی والی چہار دیواری ہے۔ اس کے آمنے سامنے دو دروازے ہیں۔ یہ باغیچہ مستطیل نما زمین پر قائم ہے۔اس کے درمیانی حصے میں ایک فوارہ بنا ہوا ہے جس سے کبھی پانی نکلتا تھا۔اس وقت پانی کی صدا ایک خوب صورت اور کیف انگیز احساس پیدا کرتی ہوگی۔جس کا آج ہم محض تصور کر سکتے ہیں۔لیکن اب یہ فوارہ خاموش ہے۔اس کے پانی کا منبع سوکھ چکا ہے۔ فوارے کے نیچے ایک دائرہ نما چھوٹا سا حوض بنا ہوا ہے۔جس میں فوارے کا پانی جمع ہوا کرتا تھا۔ اس پانی میں آبی پودے اُگائے جاتے تھے جو شعبۂ نباتات کے تجرباتی کلاسیز میں کام آیا کرتے تھے۔کالج کے احاطے میں بسیرا کیے ہوئے پرندے بھی وہاں آکر اپنی پیاس بجھایا کرتے تھے۔قبل باغیچے کے کنارے کنارے پیڑوں کی گھیرا بندی کی گئی تھی۔اس چمن بندی میں کچنار، کنیر اور چمپا وغیرہ کے پیڑ تھے اور بوگن ویلیا کی بیلیں بھی اپنی سرخ بہار بکھیرا کرتی تھیں۔لیکن ادھر چند برسوں سے اس باغیچے کی حالت اس قدر خراب ہو چکی تھی کہ وہاں اب نہ تو فوارے کا گیت باقی تھا اور نہ ہی دوب کی ہریالی۔موسمی پھولوں کا بسنت بھی نظر نہ آتا تھا۔حوض کا پانی سوکھ چکا تھا اور اس میں موجود آبی پودے بھی اب ناپید ہو چکے تھے۔لوگ باغیچے کی طرف دیکھتے لیکن اُسے اُجاڑ اور ویران پاکر افسردہ ہو جاتے۔پرندے بھی بہت شوق سے آیا کرتے تھے لیکن اس کی ابتر حالت کو دیکھ کر صدمے سے دوچار ہو جاتے اور مایوس ہو کر فوراً واپس ہو جاتے میری حالت بھی کچھ اسی طرح کی تھی۔ میں سوچتا کہ فطرت ہم سے روٹھ رہی ہے یا ہم خود فطرت کو برباد کر رہے ہیں۔

لیکن ایک روز یہ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی کہ ایک مالی اس باغیچے میں کیاریاں درست کر رہا تھا۔ میں والہانہ انداز میں باغیچے میں داخل ہوا اور مالی سے دریافت کیا۔

''کیا آپ یہاں مالی مقرر ہوئے ہیں؟''

''جی کل ہی میں نے جوائن کیا ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

کالج میں مالی کے جوائن کرنے سے مجھے بہت مسرت ہوئی تھی۔ لیکن اس وقت یہ اندیشہ بھی لاحق ہوا کہ کہیں یہ عارضی طور پر تو بحال نہیں ہوا ہے ایسا ہونے سے یہ خدشہ تھا کہ وہ کسی وقت بھی ہٹا دیا جا سکتا تھا۔ یونی ورسٹی کی اس طرح کی بحالی سے میں بخوبی واقف تھا۔ اگر ایسا ہوا تو باغیچے کے پودے بغیر کسی غم گسار کے قبل کی طرح ہی زندہ رہنے پر مجبور ہوں گے۔ موسمی پودے تو ناپید ہی رہیں گے۔ ہر موسم میں انھیں کون اُگائے گا؟ اور کس طرح ان کی آب یاری ہوگی؟ لہٰذا میں نے اس سے استفسار کیا۔

''کیا آپ کی ملازمت مستقل ہے؟''

''جی ہاں مستقل ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

مجھے اس کے جواب سے اطمینان کا احساس ہوا تھا۔

اب باغیچے کی صورت بدل رہی تھی۔ پیڑ پودے بشاش رہنے لگے تھے ایسا لگ رہا تھا کہ اب وہ بے سہارا نہیں ہیں بلکہ اُنھیں ایک مضبوط سہارا میسر ہو چکا ہے جو روزانہ سویرے اُنھیں نیند سے بیدار کرتا ہے۔ ان کے منھ ہاتھ دھوتا ہے۔ انھیں غسل دیتا ہے۔ ان کے کپڑے بدلتا ہے اور وقت پر انھیں ناشتہ اور کھانا مہیا کرتا ہے۔ چہرہ تو آئینہ ہے۔ رنج و مسرت کا عکس اس پر بالکل واضح ہو جاتا ہے لہٰذا اب یہ پیڑ پودے اچھے لگنے لگے تھے۔ ان کے ساتھ رہنے اور ان سے باتیں کرنے کی

خواہش پیدا ہوتی تھی۔ کبھی کبھی میں ان کے پاس رک جاتا اور ان سے باتیں کرنے لگتا۔ کیاریاں بھی بن گئی تھیں۔ مٹی نرم کر کے ان میں کھاد ڈالا گیا تھا۔ موسمی پھولوں کے نازک انکھوے مٹی کی تہوں سے جھانکنے لگے تھے۔ گو کہ وہ ابھی چھوٹے اور ناتواں تھے۔ پھر بھی شاید وہ سوچ رہے ہوں کہ جب ہم نے دھرتی کے سینے کو چیر ڈالا ہے تو اب اوپر آنے اور برگ و ثمر پانے میں کیا دشواری ہے۔ فوارہ تو دوبارہ جاری نہ ہو سکا تھا لیکن حوض میں پانی ڈال کر اس میں چند آبی پودوں کو ضرور اُگا لیا گیا تھا۔ جب سب کچھ بہتر ہو رہا تھا تو دوب بھی ہری بھری نظر آنے لگی تھی۔ اب میری مسرت کی انتہا نہ تھی اور پرندوں کے چہرے پر بھی خوشی کی رمق نمایاں ہونے لگی تھی۔ رنگ اور خوش بو میں دلچسپی لینے والے دیگر لوگ بھی مسرور تھے۔

باغیچے میں میری دلچسپی بڑھی تو ظاہر ہے کہ مالی سے بھی میرے تعلقات میں اضافہ ہوا۔ اکثر میں وہاں بیٹھ جاتا اور اخبار یا رسالے وغیرہ پڑھتا رہتا۔ پاس میں چائے کی دکان ہے وہاں سے چائے منگوا لیتا۔ خود بھی پیتا اور مالی کو بھی اس میں شریک کر لیتا۔ اسے میرے ساتھ چائے پینے میں جھجک محسوس ہوتی وہ معذرت کے انداز میں کھڑا ہو جاتا اور خاموش احتجاج کرتا۔ کبھی کہتا۔

''نہیں سر! آپ چائے پیجیے، میں کچھ کام کر رہا ہوں۔''

لیکن میں ضد کر کے اسے چائے میں شریک کر لیتا۔ باغیچے میں میری دلچسپی کو دیکھ کر پرنسپل صاحب نے مجھے گارڈن انچارج بنا دیا تب مالی سے میرا ربط اور بھی قوی ہو گیا۔ باغیچے میں پانی کا انتظام، موسمی پودوں کا انتخاب اور پیڑ پودوں میں تنوع اور رنگا رنگی کے اہتمام کے لیے، ہم دونوں اکثر غور و خوض کرتے رہتے۔ اُسی درمیان مجھے مالی کے پس منظر کو بھی جاننے کا موقع ملا۔ اس کا نام لالی تھا۔ وہ ایک غریب خاندان سے وابستہ تھا۔ دنیا کو سنوارنے والے ہاتھ عام طور پر غریب ہی ہوا کرتے ہیں۔ لالی کا باپ بھی مالی تھا اور غالباً یہ اس کا خاندانی پیشہ ہو گیا تھا اور اس پیشے سے

منسلک رہنے کی وجہ سے برسوں قبل اُس کی ایک ذات بھی مقرر ہوگئی تھی۔ باپ نے اُسے پڑھانا چاہا۔ پڑھنے میں وہ ذہین تھا۔ لیکن غربت کی وجہ سے اس کی پڑھائی کا سلسلہ زیادہ دنوں تک قائم نہ رہ سکا تھا۔ لیکن وہ اپنی کم تنخواہ کے باوجود اپنے بیٹے کو کالج میں پڑھا رہا تھا۔ اس کا بیٹا اس کی طرح ہی ذہین اور محنتی تھا۔ وہ شاید اپنی تعلیم جاری رکھنے کے لیے کچھ ٹیوشن بھی دیا کرتا تھا۔ مٹی، پانی اور پودوں کے ساتھ رہتے ہوئے لالی بالکل ان کا ہی ہوکر رہ گیا تھا۔ لیکن اس کی محبت محدود نہ تھی۔ باغیچے میں موجود پودوں کے علاوہ اس کی توجہ باہر کے پیڑ پودوں پر مرکوز ہوجایا کرتی اور وہ ان کے دکھ سکھ کا بھی خیال رکھتا تھا۔ دن رات نباتات کے ساتھ رہنے کی وجہ سے اسے پودوں کے امراض کا بھی کچھ علم ہوگیا تھا۔ ایک روز اس نے مجھ سے کہا۔

''سر! آپ کے گھر کے احاطے میں آم کا جو پیڑ ہے۔ اسکی ٹہنیاں سوکھ رہی ہیں لگتا ہے اس میں کوئی بیماری پیدا ہوگئی ہے۔''

مجھے حیرانی ہوئی۔ میں روزانہ اس پیڑ کو دیکھتا تھا۔ موسم گرما میں اس کی چھاؤں کے نیچے بیٹھ کر دلیس دنیا کے مسائل پر مضامین لکھا کرتا تھا۔ لیکن کبھی بھی میں نے اس پیڑ کے دکھ کو جاننے کی کوشش نہیں کی۔ یہ بات قابل غور تھی کہ گرد و نواح کے متعلق میری معلومات کتنی کم تھیں اور لالی کتنا باخبر۔

ایک دن وہ میرے شعبے میں آیا۔ اس وقت میں فوراً کلاس سے فارغ ہوکر آیا تھا۔ وہ میرے پاس آکر کچھ دیر خاموش رہا۔ جب میں اپنی جگہ پر بیٹھ گیا تو اس نے مجھ سے کہا۔

''سر ایک بات کہوں؟''

''ضرور کہو۔'' میں نے جواب دیا۔

''مجھے کچھ روپے ایڈوانس کی ضرورت ہے۔ آپ پرنسپل صاحب سے کہہ کر دلوادیں۔ آپ کی بڑی

مہربانی ہوگی۔"

"تم ان روپیوں کا کیا کروگے؟ تنخواہ تو ابھی ہی ملی ہے۔" میں نے پوچھا۔

جی میرے بیٹے نے آئی آئی ٹی کمپیٹ کیا ہے۔ اس کے داخلے کے لیے مجھے روپے کی ضرورت ہے۔ اس نے جواب دیا۔

"آئی آئی ٹی کمپیٹ کیا ہے۔" میں اس کے جواب سے چونکا۔ مجھے اس خبر سے ازحد خوشی ہوئی تھی۔ ایک غریب کے گھر میں خوشیوں کا چراغ روشن ہوا تھا۔ امیدوں کی ایک قوس قزح بنی تھی۔ امید کی خوشی کتنی اہم شے ہے۔

یہ تو بہت اچھی خبر ہے۔ اب تمہارا بیٹا انجینئر بن جائے گا مبارک باد قبول کرو میں نے خوشی کا اظہار کیا اور تھوڑے وقفے کے بعد پھر کہا۔

"میں ضرور ایڈوانس دلوادوں گا۔"

"بس آپ لوگوں کی دعاؤں کا اثر ہے۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا اور باغیچے کی طرف واپس ہوگیا۔

لالی کے جانے کے بعد مجھے شرمندگی کا احساس ہوا۔ میں نے اس کے بیٹے کی تعلیم میں کوئی مدد نہ کی تھی۔ یہاں تک کہ ایک بار اس کا بیٹا کسی کام سے کالج آیا تھا تو لالی نے اُسے مجھ سے ملوایا تھا لیکن اس کے پیر چھونے پر میں نے اسے آشیرباد دینے کے علاوہ اس سے اور کوئی بات نہ کی تھی۔ حالانکہ اس لڑکے کو اس بات کا تجسس ضرور رہا ہوگا کہ میں اُس سے کچھ باتیں کرتا۔ اس کی دلچسپیوں کو جاننے کی سعی کرتا اور اس کی معلومات کے خزانے کو ٹٹولتا۔ اس وقت مجھے بھی اپنی نارسائی کے دن یاد آگئے تھے۔ میرے بچپن اور لڑکپن کے دنوں میں جب کبھی ہمارے یہاں

خوش حال اور اعلیٰ عہدے پر فائز رشتے دار آیا کرتے تھے تو میری بھی خواہش ہوا کرتی تھی کہ وہ مجھ سے باتیں کرتے۔ میری دلچسپیوں کے متعلق پوچھتے۔ لیکن ان کی دلچسپی کبھی بھی مجھ میں نہیں ہوا کرتی تھی۔ بہت ہوا تو انھوں نے سلام کا جواب دے دیا۔ نام پوچھ لیا۔ کس درجے میں پڑھتے ہو دریافت کرلیا۔ بعد ازاں ایک طویل خاموشی لاتعلقی اور خودنمائی۔

لالی کو ایڈوانس مل گیا تھا۔ پرنسپل صاحب لالی کے بیٹے کی کامیابی کی خبر سن کر بہت خوش ہوئے تھے۔ دیگر اساتذہ نے بھی اس خبر سے مسرت محسوس کی تھی۔ لالی جب داخلے کے لیے بیٹے کو ساتھ لے کر کسی دور کے شہر جا رہا تھا تو وہ ایک بار پھر اُسے لے کر میرے پاس آیا تھا اس بار وہ میرے گھر آیا تھا۔ اب وہ محض کالج کا ایک مالی ہی نہیں بلکہ مستقبل کے ایک انجینئر بیٹے کا باپ بھی تھا۔ اس روز میں نے ان لوگوں کی خاطر داری کی تھی۔ بیٹے کو کرسی پر بٹھایا تھا لالی کو بھی بیٹھنے کے لئے کہا تھا۔ شاید یہ پہلا موقع تھا کہ وہ میرے سامنے کرسی پر بیٹھ رہا تھا۔ میں نے ان لوگوں کو چائے کے ساتھ کچھ ناشتہ وغیرہ بھی پیش کیا تھا جب دونوں رخصت ہونے لگے تو میں نے لالی سے کہا۔

''لالی! تم نے پیڑ پودوں کی خدمت میں زندگی گزار دی۔ کیا تمہارا بیٹا بھی انجینئر بن کر مٹی پودوں کو یاد رکھ سکے گا۔''

''ضرور یاد رکھے گا۔ میں نے اس کی تربیت ہی اس انداز سے کی ہے۔ ہاں میں دوسروں کے باغیچوں میں پودوں کی خدمت کرتا رہا ہوں جبکہ وہ اپنے گھر میں ان کی آب یاری کرے گا۔ اس نے بڑے اعتماد سے میرے سوال کا جواب دیا۔ لالی کے بیٹے نے خاموش مسکراہٹ سے باپ کے بیان کی تائید کی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ جب ہم اپنے بچوں کی ایسی تربیت کریں گے تو پیڑ سدا موجود رہیں گے۔ مٹی کی خوش بو ہمارے وجود کو معطر کرتی رہے گی۔ آب وہوا کا توازن برقرار رہے گا۔ فطرت کے نظاروں اور رعنائیوں سے ہم کبھی محروم نہ ہوں گے۔

اس روز دن کے گیارہ بج رہے ہوں گے کہ لالی پریشان حال میرے پاس آیا اس وقت بھی میں اپنے شعبے میں تھا اور کسی کتاب کے مطالعے میں محو تھا۔ اس کا بچہ کئی روز سے بیمار تھا اور آج اچانک اس کی طبیعت زیادہ خراب ہوگئی تھی۔ اس کی بیوی بچے کو لے کر اسپتال جا چکی تھی اور گھر سے کوئی اُسے بلانے آیا تھا۔ وہ فوراً اسپتال جانا چاہتا تھا لہٰذا وہ اس بات کی اجازت لینے کے لیے میرے پاس آیا تھا۔ میں نے اُسے اجازت دے دی وہ تیزی سے اسپتال کی طرف لپکا۔ اس کے روانہ ہونے کے بعد میں دوبارہ مطالعے میں محو ہوگیا اور اس واقعے کو فراموش کر بیٹھا۔

دوپہر کے وقت کھڑکی سے باہر جھانک رہا تھا کہ لالی کالج میں داخل ہوتا ہوا نظر آیا۔ اس کے چہرے پر مسرت اور سکون کی لکیریں نظر آرہی تھیں۔ قدم بھی اس کے اطمینان سے اٹھ رہے تھے۔ مجھے تسلی ہوئی کہ یقیناً اس کے بچے کی حالت میں اصلاح ہوئی ہے اور اب وہ خطرے سے باہر ہے۔ میں نے سوچا کہ بہتر موقع ہے رفاقت کا جذبہ مزید استوار ہوگا۔ کیوں نہ میں خود باغیچے میں جا کر اس کے بچے کی خیریت دریافت کرلوں۔

لالی چند مرجھائے ہوئے پودوں کے پاس کھڑا تھا یہ پودے دھوپ کی شدت سے مرجھا گئے تھے۔ وہ اسپتال جانے سے قبل زیادہ تر پودوں کو سیراب کر چکا تھا۔ وہ پودے شاداب نظر آرہے تھے۔ لیکن بس یہی چند پودے تھے جو پریشان حال اور افسردہ تھے۔ وہ بے جان نظر آرہے تھے اور ان کے لبوں پر تشنگی کا احساس شدید تر تھا۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ یہ پودے اب زیادہ دیر تک کھڑے نہ رہ سکیں گے۔ بلکہ جلد ہی زمیں بوس ہو جائیں گے۔ مجھ سے روبرو ہونے سے قبل ہی وہ پانی لے کر ان پودوں کی پیاس بجھانے لگا تھا میں نے وہاں پہنچ کر دریافت کیا۔

”لالی! تمھارا بچہ کیسا ہے؟“

”جی اب ٹھیک ہے۔“ اس نے جواب دیا۔

''تم کچھ دیر اور اسپتال میں رہ لیتے شاید وہاں تمھاری ضرورت ہو''میں نے کہا۔

''جی نہیں سر! وہاں اب سب ٹھیک ہے''اس نے جواب دیا۔ چند لمحوں کے بعد وہ پھر گویا ہوا۔

''سر یہ پودے بھی تو میری نظروں میں گھوم رہے تھے۔ میں انھیں سینچے بغیر چلا گیا تھا۔''

لالی کی باتوں سے میں متعجب ہوا۔ وہ کچھ اس طرح کہہ رہا تھا۔ جیسے یہ پودے نہیں اس کے بچے ہوں جن کی پرورش میں کوتاہی ہو رہی تھی۔ ذمہ داری کے تئیں اس کے انہماک کو دیکھ کر مجھے مسرت ہوئی تھی۔

سوزِ دروں

اسکول کی چوتھی گھنٹی جاری تھی۔ جغرافیہ کے ٹیچر خلیج بنگال، بحر ہند اور بحیرۂ عرب وغیرہ میں الجھے ہوئے تھے۔ وہ بچوں کو تمام ممکن طریقوں سے ہندوستان کے مشرق، جنوب اور مغرب میں پھیلے ہوئے سمندری وسائل کو سمجھانے میں منہمک تھے لیکن اس وقت بچوں کی توجہ پڑھائی میں نہیں ہو پا رہی تھی۔ دراصل یہ گھنٹی روزانہ خلل کا شکار ہو جایا کرتی تھی۔ اس لیے کہ اس گھنٹی کے بعد ٹفن کا وقفہ ہوا کرتا تھا۔ اس وقفے کے تصور میں ان کے ذہن ایک جگہ مرکوز نہیں ہو پاتے تھے۔ لہٰذا روزانہ صورت حال یہ ہوتی تھی کہ ٹیچر، بچوں کو سمجھانے میں مصروف رہتے لیکن بچوں کا ذہن بیگ میں رکھے ٹفن یا کینٹین میں موجود خورد ونوش کی اشیا میں الجھا ہوا رہتا۔ اس وقت بھی ٹیچر بحر ہند کی وسعتوں میں گرفتار تھے اور طلبہ کھانے کے تصور میں گم۔ ٹفن کی گھنٹی بجی۔ جن بچوں نے اپنا لنچ لایا تھا وہ میدان کی طرف لپکے کہ جہاں وہ جاڑے کی راحت افزا دھوپ میں لنچ لے سکیں۔ جن بچوں نے اپنا لنچ نہیں لایا تھا اور وہ خوش حال گھرانوں کے چشم و چراغ تھے۔ ان لوگوں نے کینٹین کی طرف رجوع کیا۔ لیکن جاوید ان ہنگاموں سے بے نیاز، تیزی کے ساتھ اپنے گھر کی طرف روانہ ہوا۔

چوتھی گھنٹی شروع ہوتے ہوتے اس کی طبیعت مضمحل ہونے لگی تھی۔ دراصل صبح جب وہ ضروریات سے فارغ ہو کر پڑھنے میں مصروف تھا تو اسے یہ دیکھ کر فکر لاحق ہو رہی تھی کہ اب تک اس کی والدہ چارپائی پر دراز تھیں اور گھر کا چولھا سرد پڑا تھا۔ اس نے ساڑھے نو بجے تک پڑھائی لکھائی کا کام انجام دیا اور جب اسکول روانہ ہونے کا وقت آیا تو وہ دبے پاؤں والدہ کے پاس گیا اور ان سے دریافت کیا کہ اسکول جانے کا وقت ہو گیا ہے لیکن آپ نے اب تک ناشتہ تیار نہیں کیا۔ والدہ خود

فکر مند تھیں۔ رنج وغم کے اثرات ان کے چہرے پر نمایاں تھے۔ انھوں نے اداسی آمیز لہجے میں جواب دیا کہ آج گھر میں پکانے کے لیے کچھ نہیں تھا، لہٰذا ناشتہ تیار نہیں کر سکی۔ تم کسی طرح اسکول چلے جاؤ۔ ٹفن کے وقت گھر آ جانا تمہارے والد صاحب خوانچہ لے کر سویرے بازار گئے ہیں۔ تھوڑی دیر میں ضرور کچھ پیسے لے کر آ جائیں گے۔

جاوید ایک غریب خاندان کا پروردہ معصوم لڑکا تھا۔ اس کے والد خوانچہ فروش تھے۔ بازار میں خوانچہ لگائے پھرنے کے علاوہ ان کے پاس آمدنی کی کوئی دوسری صورت نہیں تھی۔ خاندان زیادہ بڑا نہیں تھا۔ والد، والدہ اور چند چھوٹے بھائی بہن۔ پھر بھی محدود آمدنی کی وجہ سے تنگ دستی اور عسرت میں زندگی بسر کرنا اُن کا مقدر بن گیا تھا۔ لیکن علم کی اہمیت کی وجہ سے یہ لوگ تمام تر مجبوریوں کے باوجود اپنے بچوں کو زیور علم سے آراستہ کرنے میں لگے ہوئے تھے۔ انھیں اس بات کا اعتراف تھا کہ علم کی دولت نہ صرف زندگی میں ترقی کی راہوں کو ہموار کرتی ہے بلکہ افراد کے اخلاق واطوار کی ترتیب وتہذیب میں بھی معاون ثابت ہوتی ہے۔ لہٰذا ان لوگوں نے مصائب جھیل کر جاوید کو اسکول میں داخل کر رکھا تھا۔ والد تو خیر مزدور قسم کے آدمی تھے۔ صبح سویرے وہ خوانچہ لے کر نکل جاتے تو دیر رات گزر جانے کے بعد ہی گھر واپس آتے۔ بہت ہوا تو کسی وقت گھر آ کر دن کا کھانا کھا لیتے۔ لہٰذا اُنھیں اِدھر اُدھر کی باتیں سوچنے کی مہلت بھی نہیں ملتی لیکن جاوید کی والدہ ذرا جذباتی قسم کی خاتون تھیں۔ وہ خواب پسند تھیں اور تخیلات کے گرداب میں الجھی رہا کرتی تھیں۔ وہ فرصت کے لمحات میں اکثر خوابوں کی تتلیوں کا تعاقب کرتیں۔ کبھی سرخ رنگ کی تتلی کبھی نیلے رنگ کی تتلی۔ غرضیکہ کوئی نہ کوئی ارمان ان کے دل میں مچل جایا کرتا تھا۔ وہ سوچا کرتیں کہ جاوید پڑھنے میں ذہین ہے۔ محنتی بھی ہے۔ گھر کے مسائل میں دلچسپی رکھتا ہے۔ والدین کا فرماں بردار ہے۔ بھائی بہنوں سے بھی محبت کرتا ہے۔ غرضیکہ بہت ساری خوبیاں اس میں ہیں۔ اگر اس نے تعلیم حاصل کر لی اور اسے اچھی ملازمت مل گئی تو اس گھر کا دکھ ہمیشہ کے لیے دور

ہو جائے گا اور درد کی فصلیں خوش حالی کے خوشے میں تبدیل ہو جائیں گی۔ دیواروں میں لگے
لونے اور چھپروں میں عنکبوت کے جالے پھر نظر نہیں آئیں گے۔ بیٹے کے گردار مانوں کے بالے
بناتے وقت والدہ کے چہرے پر روشن امیدوں کی چمک پھیل جاتی۔ معلوم ہوتا کہ آنکھوں میں
دیوالی کے دیے جل اٹھے ہیں۔ تصورات کے پردے میں اس وقت جاوید کا چہرہ ان کی آنکھوں
میں رقص کرنے لگتا اور وہ اسے چوم لینا چاہتیں۔

گو کہ زندگی کے ماہ وسال میں تنگ دستی، عسرت اور کم مائیگی کے عناصر جا بجا موجود تھے۔ ہر روز کوئی
نہ کوئی آرزو دم توڑتی۔ کبھی جاڑے میں مناسب کپڑوں کی کمی محسوس ہوتی۔ کبھی عید و بقرعید کے
موقعوں پر افرادِ خانہ کو کم مائیگی کے احساس سے گزرنا پڑتا۔ پھر بھی فاقہ کشی کی نوبت نہیں آتی تھی۔
دو شام کی روٹی کی کوئی نہ کوئی سبیل ضرور نکل آتی۔ نانِ جویں میں بھی لذت محسوس ہوتی۔ روٹی سے
نکلنے والی بھاپ کا اپنا ایک لطف ہوتا۔ یہ روٹی کے ساتھ سالن کا مزہ دیتی اور اس حدت میں بھی
ایک خوش لذتی پوشیدہ رہتی۔ یوں گزر بسر مناسب طریقے سے ہو رہی تھی کہ اچانک فاقہ کشی نے
دستک دے دیا۔ اس کا بھیانک سایہ خاندان کے وجود پر منڈلانے لگا۔ دراصل چند دنوں سے
مستقل بارش ہو رہی تھی۔ اس بارش نے خوانچہ والوں کے کاروبار کو پریشانی میں ڈال دیا تھا۔ یہ
برسات کا موسم نہیں تھا پھر بھی آسمان ابر آلود تھا۔ تیز ہوائیں چل رہی تھیں اور موسلا دھار بارش
ہو رہی تھی۔ بارش کی رفتار سے ایسا اندازہ ہو رہا تھا کہ آسمان میں کہیں سوراخ ہو گیا ہے اور ابر
میں موجود تمام پانی اب زمین پر آ کر ہی دم لے گا۔ خیر پھر موسم بدلا۔ شام کے وقت سے بارش
نہیں ہوئی تھی اور آسمان کا نیلا پن واپس آ گیا تھا۔ گذشتہ رات آسمان کی چادر پر چاند تارے تو نظر
نہیں آئے تھے لیکن سپیدۂ سحری سے قبل نیل گوں آسمان میں چند ستارے ضرور جھلملائے تھے اور صبح
ہوئی تو آفتاب اپنی پرانی آب و تاب کے ساتھ طلوع ہوا تھا۔ موسم کی اس خوش گوار تبدیلی سے

غریبوں میں ایک آس جگی تھی۔ وہ تلاش معاش کے لیے اپنے اپنے گھروں سے نکل آئے تھے۔ جاوید کے والد بھی اپنے ناتواں دوش پر خوانچہ اٹھائے علی الصباح ہی بازار کی طرف روانہ ہو گئے تھے۔

والدہ کے کہنے پر جاوید بغیر کچھ کھائے مایوس قدموں سے اسکول کے لیے روانہ ہوا۔ وہ وقت پر اسکول پہنچا۔ اس کے سامنے گھنٹی بجی اور پڑھائی کا آغاز ہوا۔ اس کے درجے میں بہت سارے خوش حال گھروں کے بچے بھی تھے جو اپنی آسودگی سے سرشار تھے۔ ان کی صحت، ان کی خوش لباسی، انھیں دیگر بچوں سے ممتاز بنائے ہوئے تھی۔ لیکن ان باتوں سے جاوید کبھی احساس کمتری میں مبتلا نہیں ہوتا تھا۔ وہ اپنی پڑھائی کے دوران اکثر اسباق میں پڑھ چکا تھا کہ دنیا کے بہت سارے غریب و نادار لوگوں کے بیٹے بھی پڑھ لکھ کر بڑے آدمی بنے ہیں۔ اسے ابراہیم لنکن اور اس جیسے دوسرے بہت سارے نام از بر رہا کرتے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ غربت میں ذرائع کی کمی ضرور ہو جاتی ہے۔ لیکن اس سے جدوجہد کی قوت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ ایسے لوگوں میں کچھ کر گزرنے کی شدید خواہش پیدا ہوتی ہے۔ بہت زیادہ آرام پسند زندگی میں وہ بات نہیں رہتی جو زندگی کے چراغ کو روشن اور تاباں رکھ سکے۔ لیکن آج اس کی سوچ میں کچھ تبدیلی رونما ہو رہی تھی۔ وہ آج اپنے درجے کے خوش حال لڑکوں سے خود کو علاحدہ تصور کر رہا تھا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ شاید اس کے علاوہ سب لڑکے شکم سیر ہو کر اسکول آئے ہیں۔ شاید ان کے بیگ میں لنچ کے ڈبے موجود ہیں اور شاید سب کی جیبوں میں کینٹین کا لطف حاصل کرنے کے لیے پیسے بھی ہیں جبکہ اس نے گذشتہ رات بھی تو کسی طرح پیٹ کی آگ ہی تو بجھائی تھی اور سویرے سے اس نے اب تک منہ میں اناج کا ایک دانہ بھی نہیں ڈالا تھا۔ اس نے سوچا کہ اس کے اور اس کے درجے کے خوش حال لڑکوں کے درمیان کتنا فرق ہے۔

بہر حال گھنٹیاں بجتی رہیں۔ کلاسیز ہوتے رہے۔ ٹیچرز آتے اور جاتے رہے۔ لیکن کسی بھی گھنٹی

میں جاوید کی طبیعت پڑھائی کے اسباق میں نہیں جم سکی۔ ایسا شاید اس کے ساتھ پہلی بار ہوا تھا۔ وہ بہت سنجیدہ طالب علم تھا اور سدا دل جمعی کے ساتھ ٹیچر کی بتائی ہوئی باتوں کو سنتا تھا۔ انھیں سمجھنے اور ذہن نشیں کرنے کی کوشش کرتا۔ بلیک بورڈ پر لکھی گئی باتوں کو نقل کرتا لیکن آج اس کا دل نہ تو زبان و ادب کی کتاب میں لگ رہا تھا اور نہ تواریخ اور نہ ہی سوکس (Civics) میں۔ اشعار اسے بے جان نظر آرہے تھے۔ بادشاہوں کے چہرے پر جنگل اُگا ہوا محسوس ہو رہا تھا اور سوکس کے متن میں ہر جگہ فریب دکھائی پڑ رہا تھا۔ اگر وہ عمر دراز ہوتا اور اس کا شعور بالیدہ ہوتا اور اُسے اظہار و بیان کی قوت حاصل ہوتی تو وہ شاید اپنے خالی پیٹ کی چبھن کو کچھ یوں بیان کرتا۔ بھوک کی آگ کو سرد کرنے کے لیے اب تک کوئی لفظ وجود میں نہیں آیا ہے۔ کسی بھی زبان میں۔ کسی بھی لغت میں ایسا کوئی لفظ نہیں ہے۔ مذہب ہو یا سیاست، فلسفہ ہو یا ادب و ثقافت سب بھوک کے سامنے بے بس ہیں۔ بھوک کی آگ ٹھنڈی ہوتی ہے فقط ایک شے سے اور وہ روٹی ہے۔ لیکن وہ ایک معصوم بچہ تھا۔ بس لڑکپن کی حدوں میں داخل ہوتا ہوا۔ نویں کلاس کا طالب علم۔ ایک نابالیدہ اور ناتراشیدہ ذہن، وہ ابھی اس قسم کے خیالات کو خام انداز میں محسوس تو کر سکتا تھا لیکن انھیں الفاظ کا جامہ پہنانے سے قاصر تھا۔

ٹفن کی گھنٹی بجی تو وہ تیز قدموں سے گھر کی طرف لپکا۔ بھوک کی وجہ سے اس پر نقاہت کی کیفیت تھی۔ ذہن میں اضطراب و انتشار کا عالم طاری تھا۔ وہ فکر میں ڈوبا ہوا گھر کی طرف بڑھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ پتہ نہیں ابا کا سامان فروخت ہو سکا یا نہیں۔ اگر آج بھی کچھ آمدنی نہیں ہوئی ہوگی تو پھر کھانا کہاں سے پکا ہوگا۔ والدہ تو اسی طرح بستر پر پڑی ہوں گی۔ انھیں بار بار قرض کون دے گا؟ بنیا بھی تو اب ادھار آسانی سے نہیں دیتا ہے۔ چھوٹے بھائی بہنوں کا پتہ نہیں کیا حال ہوگا؟ اسی طرح سوچتا ہوا وہ آگے بڑھتا رہا۔ اسے راہ میں بہت سی چیزوں کا سامنا ہوا۔ رنگ برنگ کی موٹر گاڑیاں۔ خوب صورت سجے سنورے بچے، عالی شان عمارتیں، دکانوں میں انواع و اقسام کی

چیزیں جنھیں وہ روز دیکھتا تھا اور ان سے لطف اندوز ہوتا تھا لیکن آج ان میں سے کوئی بھی منظر اس کی آنکھوں میں جذب نہیں ہوسکا۔ دراصل خیالات کا سر چشمہ دل کے اندر سے نہیں پھوٹتا ہے۔ بلکہ اس کا تعلق دل کی بیرونی کیفیات سے ہوتا ہے۔ دل تو محض ایک آئینہ ہے۔ اس میں خارجی اشیا اور مادی حالات کا ہی عکس پیدا ہوتا ہے۔ جاوید بھی اسی کیفیت سے دوچار ہورہا تھا۔ بازار کی رونق اس کے بے چین دل کو ذرا بھی اچھی نہیں لگ رہی تھی۔ راستے میں اگر اس کی نظر کہیں جمی اور اس کا خیال کہیں مرکوز ہوا تو وہ چند کچڑا چننے والے بچے تھے یا ایک خارش زدہ کتا جو حلوائی کی دکان کے سامنے کوڑے کے ڈھیر پر پھینکی گئی جوٹھی پتلوں کو چاٹ رہا تھا۔ اسے بہت افسوس ہوا کہ بھوک کی شدت کی وجہ سے جوٹھی پتلوں میں موجود سبزی کا رس اور پوری کے زرّوں کا نمکین مزہ اس کے منھ میں بھی آ گیا تھا۔ اسے اس صورت حال پر ندامت محسوس ہوئی۔ وہ اخلاقی طور پر اس قدر کمزور ہونا نہیں چاہتا تھا۔ اسے متلی سی آ گئی۔ گھر ابھی کچھ اور فاصلے پر تھا۔ اس نے اپنی رفتار میں تیزی لائی لیکن وہ خارش زدہ کتا اور کچڑا چننے والے بچے اس کی آنکھوں کے سامنے گردش کرتے رہے۔ جاوید نے سوچا وہ بچے کوڑے کے ڈھیر پر سے پولی تھین کے بیگ، پلاسٹک، ٹین اور لوہے کے ٹکڑوں کو یکجا کر کے کسی کچڑے کی دکان لے جائیں گے اور ان کی قیمت پانے سے پہلے بہت سی باتیں ان کے دل میں طے پا چکی ہوں گی کہ ان پیسوں سے وہ اپنے گھر والوں کے لیے چاول، دال اور سبزی خرید لے آئیں گے اور ہوسکا تو اگلے دن ایک فلم بھی دیکھ لیں گے۔ لیکن جو صورت حال ہے اس میں قیمت پانے کے بعد ان کے تمام سپنے آنسو کی طرح جھڑ جائیں گے۔ کوڑا چننے والے بچوں کو غصہ بھی آئے گا مگر وہ اپنے غصے کا اظہار نہیں کر پائیں گے کہ پھر انھیں کوڑے کے ڈھیر پر جانا ہے۔ پتہ نہیں جاوید کس قدر ذہنی خلجان میں مبتلا تھا کہ اس کے ذہن میں کبھی کچڑا چننے والے بچوں کے چہرے اس کے والد کے چہرے میں گڈمڈ ہو جاتے اور کبھی خود اس کا چہرہ کچڑا چننے والے کسی بچے کے چہرے میں مدغم ہو جاتا۔ وہیں آس پاس میں کہیں پر وہ خارش زدہ کتا بھی موجود رہتا۔ سب مل کر ہم شکل ہو جاتے اور بالکل ایک جیسے معلوم ہونے لگتے۔

جاوید خیالات میں الجھا ہوا گھر پہنچا۔ وہ گھر کے اندر انتہائی اضطراب و تجسس کے عالم میں داخل ہوا لیکن اندر جا کر اسے کچھ راحت کا احساس ہوا۔ والد آنگن میں منہ دھو رہے تھے۔ بھائی بہن بیٹھے پر امید نگاہوں سے کسی شے کے منتظر تھے۔ والدہ چولھے کے پاس بیٹھی تھیں۔ چولھے میں لپلپاتی آگ ایک خوب صورت منظر پیش کر رہی تھی۔ یہ وہی آگ تھی جو انسانی جسموں کو خاکستر کر دیتی ہے تو ہول ناک اور قابل نفرت معلوم ہوتی ہے۔ لیکن جب یہی آگ توے اور ہانڈیوں کو گرمی پہنچاتی ہے اور اناج و سبزیوں کو کھانے کے قابل بناتی ہے تو وہ بہت مخلص، مہربان اور زندگی آمیز معلوم ہوتی ہے۔ اس نے چولھے میں موجود آگ کو دور سے دیکھا۔ پھر بھی اسے محسوس ہوا کہ آگ اس کے بالکل نزدیک ہے اور اس کے سرد اور بے جان جسم میں قوت اور حرارت پہنچا رہی ہے۔ جاوید کو دیکھ کر اس کی والدہ کی آنکھوں میں آنسو کے قطرے لرز گئے۔ ان قطروں میں اگر ایک طرف بے چارگی تھی تو دوسری طرف امید کی خوشی کی قوس قزح اپنے سات رنگوں کی کمان کے ساتھ موجود تھی۔

کھانا تیار ہونے میں تاخیر ہو گئی تھی۔ لہٰذا کھانے سے فارغ ہو کر جاوید جب اسکول پہنچا تو ٹفن کی گھنٹی ختم ہونے کے بعد اب پانچویں گھنٹی بھی اختتام پر تھی۔ اس نے کلاس روم کے دروازے کے پاس کھڑے ہو کر ٹیچر سے اندر داخل ہونے کی اجازت چاہی۔ یوں گھنٹی ختم ہونے کو تھی۔ پھر بھی ٹیچر نرم دل تھے۔ انھوں نے اجازت دے دی۔ کسی ٹیچر کے غیر حاضر ہونے کی وجہ سے اس وقت تواریخ پڑھائی جا رہی تھی۔ ٹیچر اپنا موضوع مکمل کرنے کے بعد اب بچوں سے موضوع کے متعلق سوالات کرنا چاہ رہے تھے۔ وہ ابھی بنچ پر بیٹھا ہی تھا کہ ٹیچر نے بچوں سے سوال پوچھ ڈالا ''بتاؤ! انقلاب فرانس کے اسباب کیا تھے؟'' مختلف لڑکوں نے اس سوال کا جواب دیا۔ جواب الگ الگ انداز کے تھے۔ جاوید نے اس میں حصہ نہیں لیا۔ وہ خاموش بیٹھا رہا۔ اس کے ذہن میں جو جواب اُبھر رہا تھا۔ اسے وہ مناسب الفاظ نہیں دے پا رہا تھا۔ حالانکہ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اس انقلاب کا اصل سبب بھوک ہی رہا ہوگا۔

سلگتا کرب

سکندر کو سخت گھٹن کا احساس ہو رہا تھا۔اس کے سامنے آہنی سلاخیں تھیں اور ان سلاخوں کے باہر پولس اسٹیشن کے احاطے میں اس کی بوڑھی ماں اور جوان بیوی رو رو کر ہلکان ہو رہی تھیں..... پچھلی رات ہی سے سکندر حاجت کے اندھیرے کا قیدی تھا۔ وہ اپنے وجود کو اس اندھیرے میں گم کر دینا چاہتا تھا۔اپنی ماں اور بیوی کے غموں سے فرار چاہتا تھا۔اس کی خواہش تھی کہ اس کے دل کی وادی سو جائے اور اس میں بیتے دنوں کی باد سموم نہ چلے۔اسے خود فراموشی کی ضرورت تھی تا کہ دل کے زخموں کی ٹیس سے کم از کم وقتی طور پر نجات مل سکے۔لیکن سکندر نے محسوس کیا کہ یہ باتیں ممکن نہیں ہیں۔جس وقت سے وہ اس اندھیرے میں قید کیا گیا ہے۔اس وقت سے اسے ایک لمحہ بھی سکون حاصل نہیں ہے۔اس کے شعور پر اس کی یادیں حاوی ہو رہی ہیں۔تصورات کے پردے میں ماضی کے شب و روز لہرانے لگے ہیں۔رفتہ رفتہ اس کا ذہن یادوں کی وادی میں بھٹکنے لگا۔سکندر کی آنکھوں کے سامنے اس کے مالک چمن چن کا چہرہ لہرایا جس کے یہاں اس کا جسم، اس کی جان ،اسکی عقل، اس کی سوچ ، کچھ رقم پر رہن تھی اور وہ کچھ بھی نہیں تھا۔فقط اپنے مالک کا غلام۔وہ بیساکھ کی تپش آمیز دھوپ میں ، برسات کی بارش میں اور جاڑے کی سرد شاموں میں فقط زندہ رہنے کے قابل ملنے والی حقیری سی مزدوری کچھ اناج کے عوض کام کرنے والا ایک مزدور تھا۔گوشت پوست کی بنی ایک مشین تھا۔حالات کی دھوپ روز بروز گرم تر ہوتی جا رہی تھی۔مسائل کا گھنا جنگل بڑھتا ہی جا رہا تھا مگر اس کی مزدوری میں ذرا بھی اضافہ نہیں ہوا تھا۔اس وقت جب وہ کنوارا تھا، پھر اس کی شادی ہوئی اور اس وقت بھی جب اسے ایک بچہ ہوا تب بھی اس کی مزدوری یکساں رہی۔فقط ڈیڑھ سیر اناج کی خاطر وہ کام کرتا رہا۔برس ہا برس اپنے پسینے سے زمیندار کے کھیتوں کی

آب یاری کرتا رہا۔ اپنے جسم کی حرارت سے اسے گرمی پہنچاتا رہا۔ دھرتی کے سینے کو چیر کر اس میں بیج بوتا اور جب پودے اگتے تو ان کی آب پاشی کر کے انھیں زندگی کی توانائی بخشتا اور جب فصل پک جاتی تو ان کے خوشوں سے اناج حاصل کر کے مالک کی حویلی پہنچا دیتا۔ لیکن اس کے لیے تو وہی زندگی تھی۔ صرف ڈیڑھ سیر اناج!

سکندر نے محسوس کیا کہ اس کے کاندھوں پر غلامی کا جوا بہت پرانا ہے۔ اس نے اپنے مالک کے یہاں ملازمت ورثے میں پائی تھی۔ اس سے قبل اس کا باپ وہاں ملازم تھا اور اس سے قبل اس کا دادا۔ اصل میں وہ رقم کبھی ادا نہ ہو سکی جو اس نے، اس کے باپ نے، دادا نے کسی کی پیدائش، کسی کی شادی اور کسی کی موت پر اپنے مالک سے قرض لیا تھا۔ اگر اس رقم کا کچھ بھی حصہ ادا ہوا تو پھر اس کا سود جنگل کی آگ، برساتی سیلاب یا خودرو پودوں کی طرح فوراً بڑھ جاتا اور ان لوگوں کے سامنے بھیانک شکل میں آکھڑا ہوتا۔ وہ لوگ کبھی اس دلدل سے باہر نہ نکل سکے۔ سکندر کو یاد آیا کہ اس کا خاندان ہمیشہ اپنے مالک کے قرض اور سود کی بنی اینٹوں سے جوڑی ہوئی دیوار کے اندر ہی بند رہا، جو لوہے سے زیادہ مضبوط اور چٹان سے زیادہ سخت ہے اور جہاں اندھے کنویں سے زیادہ اندھیرا ہے۔ اف! زندگی کتنی تاریک ہے۔

اس تلخ احساس نے اس کے درد دل میں اضافہ کر دیا۔ سکندر نے باہر جھانک کر دیکھا۔ ماں کے آنسوؤں کے قطرے چہرے کی جھریوں پر گر کر موتیوں کی طرح چمک رہے تھے۔ اس کے دل کی وادی میں ایک بار پھر یادوں کی پروائی بہنے لگی۔ اسے اپنا بچپن یاد آیا۔ بچپن میں اسے مالک کے مویشی کھلانے اور حویلی کے چھوٹے موٹے کاموں کی ذمہ داری ملی ہوئی تھی۔ ان دنوں اسے گھر جانے کی بھی اجازت نہیں تھی۔ وہ مالک کا ہمہ وقتی ملازم تھا۔ معاوضے میں اسے فقط دو وقتوں کی روٹی ملتی تھی۔ جب بڑا ہوا تو کاشت کاری کا پورا کام مل گیا۔ صبح سے رات گئے تک گھڑی کے کانٹوں کی طرح زندگی گھومتی رہتی۔ مالک کے کھیتوں اور حویلی کے درمیان وہ کولھو کے بیل کی

طرح چکر کاٹتا رہتا۔ اس سے زیادہ اس کی زندگی میں اور کچھ بھی نہیں تھا۔ سجی سجائی آسودہ زندگی جو اس کے مالک کے بچوں کو حاصل تھی۔ وہ اس کے لیے شجر ممنوعہ تھی۔ مالک کے بچوں کو پڑھتے دیکھ کر بچپن میں اسے بھی پڑھنے کا دل چاہتا تھا۔ کبھی کبھی کام چھوڑ کر وہ ان بچوں کی کتابوں کی طرف بڑھ جاتا۔ لیکن پھر فوراً ہی مالک یا ان کے بچوں کی جھڑکیاں اس کے طلسم خیال کو توڑ دیتیں۔ اس کے سپنوں کا شیش محل چکنا چور ہو جاتا اور وہ پھر اپنے کاموں میں لگ جاتا۔ ان دنوں اس نے مالک کے بچوں کے پڑھتے وقت کچھ الفاظ سیکھ لیے تھے۔ مگر گزرتے وقت کے ساتھ حالات کی تیز دھوپ میں جب وہ بالکل مرجھا گیا تو کتابوں کے وہ مقدس الفاظ اس کے ذہن سے نکل گئے۔ اس کی زندگی کتنی محدود، کتنی معمولی اور سپاٹ تھی۔ مالک کی حویلی، کھیت اور گھر اور ان سے وابستہ زندگی کے چھوٹے چھوٹے حادثے۔ زندگی کی مجبوریاں اور فاقہ کشی کے ایام۔ ان کے سوا زندگی میں تھا بھی کیا؟ سکندر نے زندگی کی راہوں کو پیچھے مڑ کر دیکھا، وہاں کتنی ناکام تمنائیں سسک رہی تھیں۔ جب بھی وہ بیمار پڑا یا اس کے گھر کے دوسرے لوگ بیمار ہوتے تو کسی کو دوا میسر نہیں ہوتی۔ معمولی خواہشوں کی تشنگی کا کرب اور سال کے ایک دو مہینے جب فصل لگانے کا زمانہ ہوتا تو اکثر ہفتے میں ایک دو روز فاقہ کرتے رہنا اور اس بھوک کی شدت میں کمزوری سے آنکھوں کے سامنے چھائے رہنے والے اندھیرے کے باوجود کھیتوں میں کام کرنا، مشین میں گھاس کاٹنا، حویلی کے کاموں کو کرنا اور اس پر مالک کی جھڑکیاں۔ دیر سے آنے پر ڈانٹ پھٹکار اور کل سویرے آنے کی تاکید۔ زندگی اسی گھسی پٹی ڈگر پر چلنے کی عادی ہو چکی تھی۔

سکندر نے سوچا کہ وہ اس یاد کے سلگتے کرب کو کبھی فراموش نہ کر سکے گا۔ جب اس کا باپ مرا تھا۔ اس کا باپ بغیر دوا علاج کے مہینوں بستر پر پڑا رہا تھا اور جس روز اس کی موت ہوئی تھی اس روز اس کے گھر میں کھانے کو کچھ بھی نہیں تھا۔ اس نے بہت کوشش کی تھی کہ کم از کم باپ کو ہی کچھ کھانے کو دے اور وہ اس کے لیے زمیندار کی حویلی گیا، کام سے واپس آنے کے بعد ایک بار پھر۔ لیکن جب وہ راستہ ہی میں تھا تو اس کا باپ دم توڑ گیا۔ ہمیشہ کے لیے سرد ہو گیا۔ وہ زمیندار کی

حویلی کے پاس پہنچنے ہی کو تھا کہ اس کا چھوٹا بھائی دوڑتے ہوئے اس کے پاس پہنچا اور خبر دی کہ باپ مر گیا۔ یہ خبر بجلی کی طرح اس کے وجود پر گری تھی۔ اس دکھ کو اس نے بہت دنوں تک محسوس کیا تھا۔ باپ کی یاد ایک بار پھر تازہ ہو گئی۔ اس یاد نے سکندر کی آنکھوں کو نم ناک کر دیا۔ وہ حاجت کی آہنی سلاخوں سے لگا کھڑا تھا۔ آنسوؤں کے قطرے آنکھوں سے گر کر آہنی سلاخوں پر دور تک پھیلنے لگے۔

سکندر نے آنسو پونچھتے ہوئے اپنی نگاہوں کو باہر بیٹھی منگلی پر ڈالا۔ اُسے منگلی پر بہت ترس آیا، بہت ہی زیادہ پیار۔ وہ اس کے ساتھ رفاقت کے تین برس گزار چکا تھا۔ سکندر کو تین برس قبل کی منگلی یاد آ گئی۔ تین سال قبل اس کی شادی ہوئی تو یہ واقعہ اس کی زندگی میں کچھ حسن کی طرح آیا تھا اور خوب صورت یادوں کی طرح اس کے پاس اب بھی موجود تھا۔ مالک سے قرض لے کر اس نے شادی کی تھی۔ نئے کپڑے سلوائے تھے۔ کچھ بہتر کھانے کا انتظام کیا تھا۔ اس کی دلہن منگلی اس کی زندگی میں بہار کی طرح آئی تھی، تازہ ہوا کے جھونکے کی طرح آئی تھی۔ پھولوں کی خوش بو کی طرح آئی تھی۔ گرچہ پھولوں کا یہ موسم اور زندگی کے یہ خوب صورت لمحات برسات کی دھوپ کی طرح، مفلس کے شباب کی طرح فوراً ہی اس سے روٹھ گئے تھے۔ نوکری کی ذمہ داریوں اور گھر کی اقتصادی دقتوں میں جکڑی ہوئی زندگی کی وجہ سے بہت جلد اس کے ذہن سے یہ بات نکل گئی کہ منگلی خوب صورت بھی ہے، جوان، دلکش اور دلفریب بھی! مالک کے یہاں کھیتی بڑھ گئی تھی لیکن اس حساب سے مزدور نہیں بڑھے تھے اور اس لیے اس کے کام کے اوقات میں اضافہ ہو گیا تھا۔ اب وہ مالک کے یہاں کچھ سویرے جاتا۔ ایسے حالات میں منگلی کی یاد سے ذہن کو وصال کہاں نصیب؟

شادی کے دوسرے سال جب اس کے یہاں دیپو پیدا ہوا تو وہ اُسے پیار کے علاوہ کچھ بھی تو نہ

دے سکا تھا۔ من پسند کھانے، اچھے کپڑے اور خوب صورت کھلونے اس کی اوقات سے باہر تھے۔ وہ یہ چیزیں دیپو کو مہیا کرنے سے قاصر تھا۔ لیکن جب دیپو اس کے سامنے آتا تو وہ ہزار دکھوں کے باوجود اپنی مسکراہٹ دیپو کے وجود میں بکھیر دیتا اور اسے گود میں اٹھا لیتا، گلے سے لگا لیتا۔ ہوا میں اُچھال کر پھر گود میں واپس لے لیتا۔ دیپو میں اُسے تاروں کی چمک نظر آتی۔ دھنک کا حسن نظر آتا۔ پھولوں کی خوش بو ملتی اور بادِ صبا کی تازگی۔ کم از کم دل کے نرم گوشوں میں پیدا ہونے والے خوب صورت جذبوں کی تسکین کے لیے تصورات کے آسمان میں پرواز کرنے کا تو اُسے حق حاصل تھا۔ وہ دیر تک طلسم خیال میں کھویا رہا۔

سکندر نے حاجت کے اندھیرے کو ٹٹولتے ہوئے سوچا کہ اس کی زندگی میں بھیانک اندھیرا ہے۔ وہ زندگی کی کھردری راہوں پر ہمیشہ سے غلامی کا جوا ڈھوئے پھر رہا ہے۔ مالک اور اس کی عالی شان حویلی کا خوف اس کے دل کے نرم گوشوں میں دور دور تک پیوست ہے۔ مگر اس کے باوجود اس نے شاذ و نادر ہی سہی لیکن دنیا کے اُجالوں کو چھونے کی بھی کوشش کی ہے۔ پھولوں کے موسم سے آراستہ راہوں پر چلنے کی گدگدی بھی محسوس کی ہے۔ گرچہ یہ ساری چیزیں بلا مقصد و بے ارادہ ہوا کرتی تھیں اور جلد ہی زندگی کی برسوں پرانی تاریکی میں گم ہو جایا کرتی تھیں۔ سکندر نے سوچا یقیناً وہ خاموش بیل کی طرح زندگی کے کولھو کے گرد گھومتا رہا ہے۔ مالک کے کھیتوں میں اپنا پسینہ بہاتا رہا ہے اور فاقہ کشی اور علالت کے باوجود حویلی کی ذمہ داریوں کو پوری کرتا رہا ہے۔ لیکن کبھی کبھی ضرور اس کے شعور کو جلا ملتی اور اس وقت وہ کچھ الگ ڈھنگ سے سوچنے لگتا۔ اس وقت اس کے دل میں یہ بات ضرور آتی کہ کیا اس کے ساتھ ناانصافی تو نہیں ہو رہی ہے؟ اس کے ذہن میں بہت سی باتیں سوالیہ نشان بن کر اُٹھتیں کہ آخر اس کی وجہ کیا ہے کہ اسے پڑھنے لکھنے کا موقع نہیں ملا۔ وہ ان پڑھ رہ گیا اور مالک کے بیٹے پڑھ لکھ کر بابو بن گئے۔ وہ اپنا اور اپنے گھر والوں کا ٹھیک سے بدن نہیں ڈھک پاتا ہے، پیٹ بھر کھانا نہیں کھلا پاتا ہے، جبکہ مالک کے گھر

میں ساری آسانیاں فراہم ہیں۔ ان کے بچے تو دس میں روپیوں کے کھلونے کو بھی آنکھ نہیں لگاتے ہیں۔ اس کا باپ بغیر دوا علاج کے مر گیا۔ وہ خود بھی جب بیمار پڑا ہے تو اُسے کبھی دوا نہیں ملی ہے۔ وہ اور اس کے گھر کے لوگ یوں ہی بیمار رہ کر اچھے ہو جاتے ہیں اور مالک کے یہاں ذرا سی سردی اور بخار میں بھی ڈاکٹر آ جاتے ہیں۔ اس کے یہاں شادی بیاہ میں بھی وہ خوشیاں نہیں دیکھی جاتی ہیں، وہ چہل پہل نہیں رہتی ہے جو حویلی میں عام دنوں میں رہتی ہے۔ جب یہ سوالات سکندر کے ذہن میں اُبھرتے تو وہ سوچ میں گم ہو جاتا۔ اس کے ذہن میں یہ باتیں ہتھوڑے کی طرح ضربیں مارنے لگتیں۔

سکندر نے سوچا وہ محنت کرتا ہے، خون پسینہ بہاتا ہے، موسم کا سرد و گرم برداشت کرتا ہے۔ اس نے بارہا مغرور پیڑوں کو اکھاڑا ہے۔ اڑیل بیلوں کو ہل اور گاڑی میں جوتا ہے اور دھرتی کے سخت سینے کو چیرا ہے۔ جبکہ اس کا مالک گھر میں آرام کرسیوں پر آرام کرتا ہے۔ موٹر میں سفر کرتا ہے۔ انواع واقسام کے کھانے کھاتا ہے۔ قیمتی کپڑے پہنتا ہے۔ گرمی میں پنکھے اور جاڑے میں گرم کپڑوں کا استعمال کرتا ہے۔ وہ اگر میری طرح کام کرے تو چند ہی روز میں اس کا خوب صورت ٹماٹر جیسا سرخ چہرہ زرد ہو جائے گا۔ لیکن دونوں میں اتنا فرق کیوں ہے؟ ایک کا حصہ زمین کی بہت زیادہ دولت اور دوسرے کا حصہ دو وقت کی روٹی بھی نہیں۔ ہر سال ہزاروں من اناج اپجتا ہے۔ وہ مالک کے حصے میں جاتا ہے۔ کھلیان سے حویلی میں اور گداموں میں اور وہاں سے بازار میں لیکن وہ تہی دست اور تہی شکم رہ جاتا ہے۔ اس اناج میں اس کا حصہ کیوں نہیں رہتا ہے؟ جبکہ وہی اس کا خالق ہے۔ اسی کی محنت سے یہ فصلیں لہلہاتی ہیں۔

سکندر کو یاد آیا کہ جب بھی وہ ایسی تلخ باتیں سوچتا تو اس کے جسم کی حرارت بڑھ جاتی، دوران خون تیز ہو جاتا اور دماغ مزید کچھ سوچنے کے قابل نہیں رہ جاتا۔ آج بھی ان باتوں کو سوچ کر سکندر کو تلخی

کا احساس ہوا۔ وہ حاجت کے تنگ و تعفن آمیز ماحول میں ٹہلنے لگا۔ آج اُسے سختی سے اپنی زندگی کی موجودہ روش سے بے اطمینانی کا احساس ہو رہا تھا۔ اس نے سوچا کہ وہ بیس برسوں سے کتنی کٹھن زندگی گزار رہا ہے۔ اس نے مالک کے لیے کتنی محنت اور مشقت کی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ کتنی ناانصافی ہوئی ہے؟ کس قدر ظلم ہوا ہے؟ اس نے زندگی بھر مالک کی وفاداری کی۔ لیکن اُسے صلہ کیا ملا؟ اُف! چوری کا الزام اور حاجت کا اندھیرا! کل ظلم کی انتہا ہوگئی جب اُسے تنگ و تاریک حاجت میں بند کر دیا گیا۔ اب اس کے آگے آہنی سلاخیں تھیں۔ رائفلیں لیے پہرے دار اور انتظامیہ کے سخت قوانین تھے جو اس کے پیروں میں بیڑیوں کی طرح پڑے ہوئے تھے۔

اس کی دو ماہ کی مزدوری اس کے مالک چن چن کے یہاں باقی تھی۔ جب اس نے اپنی مزدوری مانگی تو مالک نے ٹال مٹول کیا۔ کئی روز کے بعد اس نے پھر اپنی مزدوری مانگی تو مالک نے نفی میں جواب دیا اور وہ اس بات کے ردعمل میں کئی روز تک کام کرنے نہیں گیا۔ ایک روز مالک نے بلا کر اسے خوب ڈانٹ سنائی۔ اس نے کہا: ''تمھیں میرے یہاں کام کرتے رہنا ہوگا، خواہ ہم مزدوری دیں یا نہ دیں۔ تمھارے یہاں میرے روپئے باقی ہیں۔ تمھارا جسم ہمارے یہاں رہن ہے۔ تم ہمارے یہاں سے کہیں نہیں جا سکتے۔'' مالک ساری باتیں کہتا رہا اور وہ خاموشی سے سنتا رہا۔ جب مالک خاموش ہو گیا تو وہ صرف اتنا کہہ سکا۔ ''مالک! میری مزدوری دیجیے تب ہم کام پر آسکیں گے، نہیں تو ہم بھوکوں مر کر کام پر نہیں آسکیں گے۔'' اس کے بعد وہ وہاں سے رخصت ہو گیا۔ مالک اس کے جانے کے بعد بھی چلاتا رہا۔ گالی گلوج کرتا رہا۔ پھر اچانک اس کے ذہن میں کوئی بات آئی۔ اس نے اپنے بیٹے کو آواز دی اور گھر کا سامان اِدھر اُدھر پھینک کر پولس اسٹیشن چلا گیا اور وہاں لکھا دیا کہ ''گذشتہ رات اس کے یہاں چوری ہوئی ہے۔ جس میں سکندر کا ہاتھ ہے۔'' اس نے کئی گواہ پیش کیے اور پولس کو رشوت دے کر اسے گرفتار کروا دیا۔ رات کے دس بجے پولس نے جب اس کے ایماندار ہاتھوں میں ہتھ کڑی ڈال دی تو مالک بہت خوش ہوا۔ اپنی فتح پر دیر تک ہنستا

بھی رہا۔ خوش ہونے اور ہنسنے کا وہی حقدار بھی تھا۔

اس واقعے کی کڑی سکندر کے دل میں محفوظ تھی۔ اس نے سوچا کہ کیا وہ کبھی ان لمحوں کو بھول بھی سکے گا۔ نہیں، ہرگز نہیں، یہ دکھ بھری یادیں اس کی زندگی کا اثاثہ بن گئی ہیں۔ بہت دیر تک یادوں کی رہ گذر میں بھٹکتے رہنے کے بعد سکندر بالکل پرسکون ہوگیا۔ اس نے محسوس کیا کہ اب اس کے پاس ماضی کی تلخیوں کے لیے فقط دکھ ہی نہیں بلکہ غصہ بھی ہے۔ اسے مالک اور انتظامیہ کے لیے بے انتہا نفرت کا احساس ہوا۔ وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ کچھ بھی ہو اس کے ساتھ ناانصافی ہوئی ہے۔ اس احساس کا زہر اس کی رگوں میں خون کے ساتھ دوڑنے لگا اور اس سلگتے کرب کی تپش سے اس کا جسم جلنے لگا۔ اس کی جاں جلنے لگی۔ اس نے سختی سے اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔ آنکھوں سے آنسو پونچھ کر مضبوطی سے آہنی سلاخوں کو تھام لیا...... اور اس کی نگاہیں پولس اسٹیشن کے احاطے میں بوڑھے برگد کے پیڑ سے چھن چھن کر آنے والی سورج کی سرخ کرنوں کا تعاقب کرنے لگیں۔

تسلسل

احسن بابو کی عمر زیادہ نہیں، پچپن اور ساٹھ کے درمیان تھی، لیکن ان کی صحت خراب رہنے لگی تھی۔ وہ راتوں کو دیر تک جاگتے رہتے۔ پچھلے پہر ہی انھیں ذرا نیند آپاتی۔ سویرے آنکھیں کھل جانے کے باوجود انھیں کمزوری کے باعث بستر چھوڑنا مشکل ہو جاتا۔ لوگ سمجھتے ہوں گے کہ احسن بابو کو بڑی گہری نیند آتی ہے، لہٰذا دیر تک بستر پر محوِ خواب رہتے ہیں۔ لیکن وہ اپنا دکھ کس سے کہتے؟ دکھ درد کے اظہار کی عادت تو انھیں کبھی رہی نہیں۔ زندگی کے مصائب ہمیشہ بغیر اُف! کیے برداشت کرتے رہتے۔

اس روز بھی وہ دیر سے جاگے ہوئے بستر پر پڑے تھے۔ جسم کے جوڑوں میں درد تھا۔ کروٹیں بدل بدل کر وہ اس کرب کو جھیل رہے تھے۔ بغل کے کمرے میں ارمان کھانسنے لگا تھا۔ کھانسی کی آواز سن کر احسن بابو کو محسوس ہوا کہ ان کے جسم کا درد فی الحال زائل ہو چکا ہے اور ارمان کی کھانسی ان کے سینے میں سما گئی ہے۔ وہ ارمان کے لیے فکرمند ہو گئے۔ ارمان ان کا بڑا لڑکا تھا۔ گذشتہ سال ہی اسے ایک دفتر میں معمولی ملازمت ملی تھی۔ اب گھر کی تمام ذمہ داریاں اسی سے وابستہ تھیں۔ احسن بابو سوچنے لگے کہ اس جوانی میں ارمان کو دمہ کی ایسی بھیانک شکایت ہے تو اور زیادہ عمر گزر جانے کے بعد، اس کی حالت کیا ہوگی؟ اس حالت میں وہ زیادہ دنوں تک ملازمت کرنے کے قابل رہ سکے گا بھی یا نہیں۔ احسن بابو اس وقت کے مشکل حالات کے تصور سے مضطرب ہو گئے۔ کاش! وہ ارمان کے مرض کا علاج شروع ہی میں کرا دیتے تو آج یہ حالت نہ ہوتی۔ لیکن وہ علاج کراتے تو کس طرح؟ اتنا پیسہ کہاں تھا کہ سب کو روٹی اور کپڑا مہیا کراتے اور دوا اور تعلیم پر بھی خرچ کرتے۔

اس لیے جو بہت ضروری تھا، وہی انجام پا سکا تھا۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں ہو سکا تھا۔ جب ارمان کو کھانسی کا زور کم ہوا تو احسن بابو نے راحت کی سانس لی۔ لیکن یہ کیا؟ تھوڑی دیر کے بعد، پھر ان کے پیروں کا درد شروع ہو گیا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئے اور خود ہی اپنے پیروں کو دبانے لگے۔ آخر کون ان کے پیروں کو دباتا؟ ارمان وہ تو خود مریض ہے۔ ابھی کھانستے کھانستے ہانپنے لگا تھا۔ بہو اور لڑکیاں.........نہیں میں ایسا خود غرض نہیں ہوں کہ ان لوگوں کو تکلیف دوں۔ بے چاریاں دن بھر گھریلو کاموں میں مصروف رہتی ہیں۔ ان لوگوں کو اور کچھ نہیں تو رات کی نیند سے تو فیض یاب ہونا چاہیے۔

''ہاں بے چاری عابدہ ہوتی تو؟''

احسن بابو کو اپنی شریک حیات کی یاد آ گئی۔ عابدہ کی یاد نے ان کے دل کے بچے کھچے قرار کو بھی ختم کر دیا تھا۔

''پیاری عابدہ!''

احسن بابو نے ایک آہ سرد بھری۔ وہ کتنی عظیم عورت تھی۔ ایک مثالی شریک حیات! احسن بابو کو یاد آیا کہ کس طرح عابدہ نے زندگی کے نشیب و فراز میں ان کا ساتھ دیا تھا۔ خاص کر ان دنوں جب گھر کے افراد ان سے نالاں رہتے تھے اور پولس ہر وقت ان کے تعاقب میں رہا کرتی تھی۔ ایک بے چاری عابدہ ہی تھی جو ان کی دل جوئی کیا کرتی تھی۔ اس کے ساتھ انھوں نے بدترین افلاس اور پریشانی کے دن گزارے تھے، لیکن اس نے کبھی کسی سے کچھ نہیں کہا تھا۔ احسن بابو کو یاد تھا کہ حقیقت میں ہنستے ہنستے دکھ جھیلنے اور کبھی زبان پر حرف شکایت نہ لانے کی عادت انھوں نے عابدہ ہی سے سیکھی تھی۔

... عابدہ کی یاد زینہ زینہ دل کے نہاں خانوں میں اترتی چلی گئی تھی۔ احسن بابو کو وہ دن یاد آیا جب

پولس نے انھیں گرفتار کرلیا تھا تو وہ دروازے پر یاس و بے کسی کے عالم میں کھڑی انھیں دیکھتی رہی تھی۔ اس نے اپنے دل کے درد کو چھپا لیا تھا اور اپنی مرطوب آنکھوں کو چھلکنے نہیں دیا تھا۔ پولس کے ساتھ جاتے ہوئے احسن بابو نے ''ہندوستان زندہ باد!، انقلاب زندہ باد!!'' کے نعرے لگائے تھے اور یہی صدا بے اختیاری میں عابدہ کے ہونٹوں سے بھی نکل گئی تھی۔ اس گونج کو انھوں نے بہت دنوں تک اپنی سماعت میں محفوظ رکھا تھا۔

جیل میں عابدہ کے خطوط موصول ہوتے رہتے تھے۔ احسن بابو بخوبی واقف تھے کہ عابدہ پر بدترین وقت آ گیا ہے۔ اسے شوہر کی جدائی کے ساتھ مالی دقتوں کا سامنا بھی کرنا پڑ رہا ہوگا۔ لیکن جب بھی وہ خط لکھتی تو اپنی خیریت تحریر کرنے سے زیادہ ان کی دل جوئی کرتی۔ صحت کا خیال رکھنے کی تاکید اور وطن عزیز کی آزادی کی جدوجہد میں تادم حیات شریک رہنے کی تلقین کرتی۔ احسن بابو خط پڑھ کر ہنس دیتے اور زنداں کے رفیقوں کو یہ کہتے ہوئے خط دکھاتے:

دیکھو! میری بیوی کو خوف ہے کہ کہیں میں جیل کی سختیوں سے بے زار ہو کر فرنگیوں سے سمجھوتہ نہ کر لوں۔''

اس طرح وقت گزرتا رہا۔ جیل کی سلاخوں کے اندر احسن بابو کے شب و روز حال کی فکر اور مستقبل کی آرزوؤں میں قربان ہوتے رہے اور ایک بوسیدہ سے گھر میں جھلملاتے چراغ کی زرد روشنی میں، ان کی اہلیہ کی جوانی کے پھول بے کار کھل کھل کر مرجھاتے رہے۔

رات نصف سے زیادہ گزر چکی تھی۔ نیند پھر بھی کوسوں دور تھی۔ ان کی یادوں کے چراغ کی لو اور تیز ہوگئی۔ احسن بابو کو یاد آیا کہ ملک کی آزادی کے بعد ہی تو انھیں گھریلو زندگی گزارنے کا موقع ملا تھا۔ عابدہ کی شخصیت کی اصل آب و تاب تو تب ہی دیکھنے کو ملی تھی۔ گھر کی آمدنی محدود تھی۔ اس لیے افراد خانہ کو ہمیشہ تنگ دستی کا سامنا رہا کرتا تھا۔ محرومیوں کی فصیلوں نے زندگی کی آرزوؤں کو قید کر

رکھا تھا۔ بس مختصر سی کاشت کا سہارا تھا۔ اس پر بھی جب کبھی سیلاب آجاتا یا خشک سالی کا سامنا ہوتا تو سال میں ایک ہی فصل پیدا ہوا کرتی تھی۔ ان دنوں مصائب میں مزید اضافہ ہو جایا کرتا تھا۔ گھر میں کبھی ایک ہی وقت کا کھانا بنتا اور وہ بھی مویشیوں کے استعمال میں آنے والے اناج پر گزارا کرنا پڑتا۔ پھر بھی یہ عابدہ کی حوصلہ مندی تھی کہ اس نے پامردی کے ساتھ ان ناموافق حالات کا مقابلہ کیا تھا اور ہمیشہ اعلیٰ اخلاقی قدروں پر قائم رہی تھی۔

وقت کچھ اور گزرا۔ ملک آزاد ہوا، لیکن آزادی کی سحر شب گزیدہ تھی۔ ملک تقسیم ہو گیا تھا۔ چاروں طرف فسادات ہو رہے تھے۔ جشن آزادی کی تقریب کی یادیں ابھی تازہ ہی تھیں کہ لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم ہو گیا تھا۔ شہر کا شراب کا مشہور تاجر پارٹی کا ضلعی صدر بن گیا تھا۔ ایک وقت تھا کہ احسن بابو نے اس کے خلاف Pickating میں حصہ لیا تھا اور اس خاطر انھیں جیل بھی جانا پڑا تھا۔ مجاہد آزادی فراموش کیے جانے لگے تھے۔ پارٹی دفتر میں شاید ہی کوئی ان کو پہچاننے والا ملتا۔ اس وقت بہت سارے لوگ سرحد پار کی راہ بھی اختیار کر رہے تھے۔ لیکن احسن بابو کا خمیر بہت ٹھوس مٹی کا بنا ہوا تھا۔ ان کے لیے یہ زمین محض اس لیے اہم نہیں تھی کہ یہاں ان کے بے شمار بزرگان دین مدفون تھے بلکہ اس لیے بھی یہ خطۂ ارض ان کے لیے جنت نشاں تھا کہ وہ یہاں پیدا ہوئے تھے اور یہیں ان کی پرورش بھی ہوئی تھی۔ لہٰذا وہ تناور درخت کی طرح اسی زمین پر اپنی جڑ جمائے کھڑے رہ گئے تھے۔

احسن بابو ان تلخ یادوں سے مضطرب ہو جایا کرتے تھے۔ اس وقت بہت سارے سوالات ان کے ذہن میں پیدا ہوتے۔ وہ ان سوالوں کا جواب ڈھونڈنے کی سعی کرتے لیکن ہر بار وہ کسی نہ کسی تنگ و تاریک گلی میں گم ہو کر رہ جاتے۔ انھیں ان کے سوالوں کا جواب نہیں ملتا۔ لوگ ان کا مذاق اڑاتے کہ اتنی جدوجہد کے بعد آخر انھیں حاصل کیا ہوا؟ وہ لوگوں کو مطمئن کرنے کی ناکام سعی کرتے، لیکن عابدہ کا جواب بالکل واضح ہوتا۔ وہ نکتہ چینوں کو جواب دیتی کہ انھوں نے تو کسی صلے

کے لیے قربانی نہیں دی تھی۔ ظالم انگریزوں کو ملک سے باہر نکالنا تھا اور یہ کام بخوبی انجام پا گیا۔ اب اگر دوسرے ظلم کی راہ اختیار کریں گے تو کوئی ان کا بھی خاتمہ کر دے گا۔

انھیں دنوں عابدہ بیمار پڑ گئی تھی۔ دق اپنے آخری مرحلے میں تھا۔ احسن بابو نے کسی طرح کچھ علاج کرانے کی کوشش بھی کی تھی۔ لیکن سب بے سود پھیپھڑوں میں اب نمو کی گنجائش باقی نہیں رہ گئی تھی۔ سیاہ دھبوں نے تمام خلیوں کو ڈس لیا تھا۔ عابدہ کے بغیر تو ان کی زندگی اور بھی تاریک ہو گئی تھی۔ پھر بھی وہ بچوں میں غم غلط کرنے کی کوشش کرتے۔ بچوں کا سامنا کرتے ہوئے انھیں زبردست پشیمانی کا احساس ہوتا۔ وہ جاں گسل احساس زیاں میں ڈوب جایا کرتے تھے۔ انھوں نے سیاسی سرگرمیوں میں اپنے شب و روز کو قربان کر دیا تھا۔ اپنے بچوں کو نہ اچھی غذا دے سکے تھے اور نہ ہی اچھی تعلیم۔ ارمان کی ملازمت اور بچیوں کی شادی، یہ سب فقط عابدہ کی کوششوں کا نتیجہ تھی۔ ان پریشانیوں کی وجہ سے نیند ان سے بے زار رہا کرتی تھی۔ وہ بڑی مشکل سے خود کو بستر میں گانٹھتے اور ذہنی قلابازیوں کے بعد ہی نیند کو مدعو کر پاتے۔

اس روز بھی ان کو نیند بہت تاخیر سے آئی تھی۔ ان کی نیند بھی کیسی ہوتی؟ ہاتھ پیر سو جاتے لیکن آنکھیں جاگتی رہتیں۔ ان آنکھوں میں کہرام مچا رہتا۔ بہت ساری سولیاں سجی رہتیں اور عجیب عجیب مناظر پتہ نہیں کہاں سے چلے آتے؟ کبھی کبھی تو لمحہ بھر بھی انھیں نیند نہیں آتی۔ اس وقت آنکھوں کا جھپکنا بھی دشوار ہو جاتا تو وہ اپنی جاگتی آنکھوں سے رات گزرتے دیکھا کرتے۔

پھر بھی وہ ان پریشانیوں کو اپنے وجود پر حاوی ہونے دینا نہیں چاہتے تھے گو کہ بدلے ہوئے حالات میں ان کے لیے اب عملی سیاست کی گنجائش نہیں رہ گئی تھی، لیکن وہ اخبار ضرور پڑھتے، پرانے ساتھیوں سے ملتے جلتے رہتے اور حالات پر ناقدانہ نگاہ رکھتے۔ فعال رہنے کی عادت تھی۔ اکثر وہ کچھ نہ کچھ کرنے کی سوچا کرتے۔ کھیتی باڑی کے کاموں میں انھوں نے دلچسپی لینی چاہی

تھی۔لیکن یہ کام ذرا دقت طلب تھا۔موسم کے سرد و گرم کو برداشت کرنے کی قوت اب ان میں نہ تھی، پھر ان کی طبیعت بھی اس طرح کے کاموں کے لیے موزوں نہیں تھی۔

وہ انھیں الجھنوں میں گرفتار تھے کہ ایک روز مغرب کی نماز کے بعد جب وہ مسجد سے باہر نکلے تو ان کی ملاقات رضوان صاحب سے ہوئی۔ وہ قصبے کے ممتاز لوگوں میں شمار ہوتے تھے، انھوں نے احسن بابو سے کہا: ''ہم لوگوں نے ایک اسکول کھولا ہے۔آپ اس میں ٹیچر کی ملازمت قبول کرلیں۔آپ تو ہائی اسکول تک اردو، فارسی اور انگریزی وغیرہ بخوبی پڑھا سکتے ہیں۔''

احسن بابو نے امتیازی نمبروں سے ایف۔اے تک کی تعلیم حاصل کی تھی۔اس کے بعد وہ تحریک آزادی میں شریک ہوگئے تھے۔لہٰذا تعلیم کا سلسلہ جاری نہ رہ سکا تھا۔ورنہ آج وہ بھی اعلیٰ ڈگریوں اور مزید بہتر صلاحیتوں کے مالک ہوتے۔انھوں نے سوچا کہ بہتر موقع ہے۔وہ ایک بار پھر تعمیری کاموں سے وابستہ ہو جائیں گے۔لہٰذا انہوں نے اس ملازمت کو قبول کرلیا۔وہ تیز قدموں سے گھر واپس آئے۔راستہ بھر سوچتے رہے کہ کاش! عابدہ ہوتی تو اسے یہ جان کر بہت خوشی ہوتی۔انھوں نے سوچا کہ زندگی جہاں سے ختم ہوئی ہے وہیں سے ایک دوسری زندگی شروع کرلینی چاہیے۔اسے ہرگز رائیگاں نہیں ہونے دینا چاہیے۔موت اگر ایک حقیقت ہے تو زندگی بھی ایک صداقت ہے اور اس کو صحیح طور سے گزارنا عبادت سے کم نہیں۔

دوسرے روز جب وہ اسکول میں بچوں کو پڑھا رہے تھے تو انھیں بڑی خوشی محسوس ہو رہی تھی کہ ان کے سامنے ڈھیر سارے امکانات روشن ہیں۔انھوں نے سوچا کہ ایک دن یہ چراغ سورج بن جائیں گے اور تب ایک دن...... اسی وقت ان کے سامنے ایک رجسٹر آیا جس میں ان کو جوائننگ کا دستخط کرنا تھا۔انھوں نے موٹے سے رجسٹر کے سفید صفحے پر اپنا دستخط ثبت کیا۔دستخط کے نیچے انھوں نے تاریخ درج کی۔۱۰راگست ۱۹۵۱ء۔

وہ چونک پڑے۔ تقریباً پانچ سال تک وہ تذبذب کے عالم میں رہے تھے۔ اس وقت ان کو کچھ اور یاد نہ آیا۔ بس نیک طینت اور عبادت گزار عابدہ یاد آ گئی۔ وہ چند لمحے عابدہ کی یادوں میں محو رہے اور پھر بچوں کو پڑھانے میں مصروف ہو گئے۔

ٹوٹی ہوئی شاخ

وہ دن کے بارہ بجے گھر پہنچا۔

اسی روز اس کے یہاں گاؤں کے لوگوں کی دعوت تھی۔ عام لوگوں کو زمین پر بٹھا کر کھانا کھلایا جا رہا تھا۔ دعوت کا یہ طریقہ روایتی طور پر چلا آ رہا تھا مگر اب خال خال ہی اُس کی مثال ملتی تھی۔ اُس نے بہت دنوں کے بعد اس منظر کو دیکھا تھا۔ اُسے شہر میں عام طور پر رکابی میں رکھے ہوئے کھانے سے سابقہ پڑتا تھا۔ بھولے ہوئے اس منظر کو دیکھ کر اس کا دل کھوئی ہوئی پیاری یادوں سے لبریز ہو گیا۔ لیکن ایک تکلیف دہ یاد بھی ان یادوں میں شامل تھی۔ اسے یاد آیا کہ ان دنوں کا رواج یہ تھا کہ دعوت میں گاؤں کے لوگوں کو زمین پر بٹھا کر کھلایا جاتا اور خاندان اور گاؤں کے معزز اور معتبر افراد کے لیے دسترخوان بچھتا۔ اسے یہ طریقہ بہت برا محسوس ہوتا تھا۔ امتیاز و تفریق کی اس کیفیت سے بوجھل اس نے ایسی دعوتوں میں کبھی سیر ہو کر کھانا نہیں کھایا تھا۔ پھر دھیرے دھیرے جسارت کر کے اس نے اپنے خاندان کے رعونت آمیز طور سے کنارہ کشی اختیار کر لی اور خود بھی عام لوگوں کے ساتھ زمین پر بیٹھ کر کھانا کھانے لگا تھا۔

اس روز بھی اس نے برسوں بعد اسی طرح کھانا کھایا۔ اس موقعے پر بہت سے لوگوں سے ملاقاتیں ہوئیں۔ ان میں پڑوس کے کئی پرانے بیڑی مزدور بھی تھے جن کے لیے اس نے کبھی بہت جلسہ جلوس بھی کیا تھا۔ لیکن اب وہ بھولی بسری باتیں تھیں۔ حالات یکسر بدل گئے تھے اور پھر اس کی اپنی طبیعت میں وہ جوش اور وہ ولولہ بھی نہیں رہا تھا۔ وقت کی اونچی دیوار کھڑی ہو جانے کے بعد پرانے آشنا لوگوں کے ساتھ کھل کر باتیں کرنا کتنا مشکل ہو جاتا ہے۔ پتہ نہیں وہ کون سی شے ہے جو حائل

ہو کر پرانی بے تکلفی ختم کر دیتی ہے۔ بس کسی طرح اس نے ملنے والوں سے ان کی خیریت دریافت کی اور پھر اپنی الجھنوں میں گرفتار ہو گیا۔

رات کے تقریباً ساڑھے آٹھ بجے شامیانے کا پروگرام تھا۔ شادیوں میں شامیانے وغیرہ کی رسم کا وہ کبھی قائل نہیں رہا تھا۔ اس نے سوچا تھا شامیانے کی تقریب میں شرکت سے وہ گریز کرے گا اور اس وقت رات کی تنہائی میں قصبے کے پرانے آشنا راستوں سے ہم کلام ہونے کے لیے کسی طرف نکل جائے گا۔ لوگ اسے پہچان نہ سکیں گے اور بڑے شہروں کی اجنبیت کا چہرہ لگائے وہ چپ چاپ گزر جائے گا۔ لیکن گھر کے لوگوں کے اصرار پر اسے تقریب میں شریک ہونا پڑا۔ حمید اختر ایک شجر سایہ دار کی طرح اہل خاندان کو ساتھ لے کر بیٹھے ہوئے تھے۔ عورتیں گیت گا رہی تھیں۔ لوگ ہنسی مذاق میں مصروف تھے۔ سب سے پہلے محمود کو جوڑا پہنایا گیا۔ ان کی شادی حمید اختر بڑے ارمانوں کے ساتھ کر رہے تھے، جیسے کوئی باپ اپنے عزیز بیٹے کی شادی کرتا ہے۔ وہ شامیانے کے لیے نئے کپڑے پہننے کے لیے تیار نہیں ہوا۔ لیکن بعد میں اسے گھر کی عورتوں کے جذبات کا احساس ہوا۔ اس نے سوچا، مجھے ان کی یہ بات مان لینی چاہیے تھی۔ شامیانے کی تقریب انجام پانے کے بعد وہ باہر بیٹھک میں چلا آیا۔ لیکن تھوڑی دیر کے بعد اسے پھر بلا لیا گیا۔ اندر ویڈیو گرافی ہو رہی تھی۔ حمید اختر، جاوید اور محمود تینوں بھائی ایک ساتھ کھڑے تھے۔ وہ بھی ان لوگوں کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔

اور پانچواں بھائی کہاں تھا؟

وہ اس وقت میلوں دور کسی دوسرے شہر میں تھا۔ برسوں پہلے حمید اختر کی شادی کے موقعے پر بھی ایک فوٹو گرافی ہوئی تھی جس میں پانچوں بھائی موجود تھے۔ پانچ بھائیوں کی ایک ساتھ وہ اکیلی تصویر بھی موجود ہے۔ اس وقت وہ سب شاداب و تر و تازہ تھے۔ ان کے خد و خال پر وقت کی

پر چھائیاں نہیں پڑی تھیں اور وہ زندگی کی ڈگر پر کسی نو آموز سپاہی کی طرح سرگرم عمل تھے۔

بارات شام کے وقت روانہ ہونے والی تھی۔لہٰذا دن کا وقت زیادہ مشغولیت اور ہنگامے کا نہیں تھا۔وہ بڑے اطمنان سے تیار ہوا۔اس کا دل چاہا کہ کہیں گھوم آئے۔لیکن کہاں؟ اسے ڈر تھا کہ کہیں کسی پرانے شناسا کا سامنا نہ ہو جائے۔بس ریلوے لائن کی طرف جانے کی صورت پیدا ہو سکتی تھی۔ریلوے لائن کے اس پار کھیتوں کے اطراف میں ٹہلا جا سکتا تھا۔جہاں طالب علمی کے زمانے میں وہ گھر کی کاشت کاری کے کاموں میں تعاون دیا کرتا تھا۔ان راستوں پر چلتے ہوئے وہ ماضی کی یادوں کو جگا سکتا تھا۔جب زندگی کے امکانات مضمحل چراغوں کی طرح گم ہونے لگتے ہیں تو ہر شخص کو اپنا ماضی پیارا معلوم ہونے لگتا ہے۔

گاؤں اور قصبے کے لوگوں کو روز کھیتوں اور ہری ہری فصلوں سے واسطہ پڑتا ہو یا نہ پڑتا ہو لیکن اسے تو شہر میں بھی روزانہ واسطہ پڑ ہی جاتا تھا۔کچھ ایسا اتفاق تھا کہ اس کے کالج کے راستے میں عین شہر کے درمیان چند قطعہ کھیت ہیں۔ان کی پگڈنڈی پر چلتے ہوئے مکئی،گیہوں،سرسوں کے پودوں کے ساتھ وہ سانس لیتا ہے۔پکتی ہوئی فصل کی خوش بو اس کے سینے میں دور گہرائی تک سما جاتی ہے۔اسے لگتا ہے جیسے وہ برسوں پرانے اپنے بچپن کے راستے پر چل رہا ہے۔لیکن وہ کہیں جا نہ سکا اور یوں ہی سوچتے سوچتے اس کا سارا وقت گزر گیا۔

وہ گہری نیند کے بعد بیدار ہوا تو سہ پہر شام کی طرف گامزن نظر آئی۔بارات کی روانگی کے لیے تیاریاں شروع ہو چکی تھیں۔اندر عورتوں نے محمود کو سنوارنا شروع کر دیا تھا۔اسے شامیانے کے نیچے نئے جوڑے پہنائے گئے۔شیروانی،ٹوپی،پگڑی،جوتے۔پھر عورتوں کے ہجوم میں جا کر وہ بہنوں اور دور نزدیک کی خواتین رشتہ داروں سے ملا۔سب نے اس کی بلائیں لیں اور خوب دعائیں دیں۔یہ زندگی کی رواداری اور حسن اخلاق کا معاملہ تھا۔سماج کی آرزوؤں اور تقاضوں پر

پورا اترنا۔ لوگ جس طرح کہیں اسی طرح کرنا۔ برسوں پہلے حمید اختر بھی اسی طرح شیروانی اور امام ضامن میں شادی کرنے کے لیے گھر سے نکلے تھے۔ مگر اس کی اپنی شادی میں ایسا کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ چھوٹے بھائی آفاق کی شادی میں بھی کوئی زیبائش، آرائش نہیں ہوسکی تھی، اس لیے کہ اس کی شادی بے جا دباؤ کے تحت وقوع پذیر ہوئی تھی۔ اپنی خواہشوں کے سامنے دوسروں کی خواہش کو روند کر سب آگے بڑھ گئے تھے۔ لیکن کیا واقعی وہ آگے بڑھے تھے یا ٹھنٹھ بن کر کھڑے رہ گئے تھے؟ اسے یہ بھی یاد آیا کہ آفاق نے اپنی دوسری شادی کے موقعے پر کچھ روایتی انداز اختیار کیا تھا لیکن اس وقت معاملات میں باسی پن آچکا تھا۔

بارات کی روانگی کے پہلے محمود کو مسجد میں دو رکعت نماز ادا کرنی تھی۔ محمود کے ساتھ وہ خود بھی گیا۔ اس نے پندرہ بیس برس سے گاؤں کی مسجد کو نہ دیکھا تھا حالانکہ خواب میں وہ مسجد کئی بار اس کی آنکھوں میں آئی تھی۔ مسجد اور اس کے نزدیک املی کا ایک پرانا پیڑ، اس کے گھنے سائے میں کوئی اجنبی سوتا ہوا، کوئی لڑکا املیاں چنتا اور گاتا ہوا۔ یہ سب کچھ کس قدر سادہ لیکن ایک پراسرار کیفیت کا حامل ہوتا تھا۔ املی کے پیڑ کے نیچے محرم اور جہلم کے میلے لگتے تھے۔ ان دنوں املی کے پیڑ کی بھی شخصیت کچھ بدلی بدلی سی لگتی۔ محرم کے دنوں میں افسردہ اور عام میلوں کے دنوں میں باغ و بہار سی۔ مسجد کو ایک بار پھر سے دیکھنے کے ارادے سے وہ محمود کے ساتھ موٹر گاڑی میں بیٹھ گیا۔ وہاں بچپن کے دنوں میں وہ اکثر نماز پڑھا کرتا تھا۔ پھر اس نے نماز پڑھنا ترک کر دیا تھا اور اب برسوں ہو چکے تھے کہ وہ مذہب سے دور تھا۔ اور مدتوں گھر نہ آنے کے سبب وہ اب مسجد کے لیے بالکل اجنبی بن گیا تھا۔ آج اس نے مسجد کے تمام گوشوں کو گھوم گھوم کر دیکھا۔ اس میں ذرا بھی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ وہی پرانی عمارت، وہی پرانے نقوش۔ فرش پر ایک کونے میں وہی بڑا سا دھبہ، امام صاحب کی محراب کے طاق پر وہی چراغ کے دھوئیں کے نشانات اور چراغ سے ٹپکے ہوئے تیل کے داغ۔ ایک لمحے کو اس کا دل چاہا کہ وہ بھی محمود کے ساتھ نماز میں شریک ہو جائے،

لیکن دوسرے ہی لمحے اُسے یہ خواہش بے تکی سی لگی۔ وہ یوں ہی ادھر نگاہیں دوڑاتا رہا۔ رات کے وقت بارات اپنی منزل کو پہنچی۔ سارے معاملات بحسن وخوبی انجام پائے۔ اگلے دن سب واپس آئے۔ بارات کی واپسی کے دودن کے بعد ولیمہ تھا۔

شام ہوتے ہی مہمانوں کی آمد شروع ہوگئی۔ تھوڑی دیر میں تقریباً سارے لوگ جمع ہو چکے تھے۔ اس کے بعد شور، غل، مبارک بادیاں، تپاک سے ملنا، یہ ہنگامے اسے اچھے لگے لیکن وہ خود کو اجنبی محسوس کر رہا تھا۔ بیشتر لوگوں کو وہ پہچان نہیں پا رہا تھا۔ بہت سارے پرانے شناساؤں کے نام بھی اس کے ذہن کے پردے پر دھندلا چکے تھے۔ کئی لوگوں سے روبرو ہونے پر اُسے بڑی شرمندگی کا سامنا کرنا پڑا۔

ولیمہ کی تقریب جاری تھی کہ آفاق کے آنے کی خبر ملی۔ اس سے اس کی ملاقات ذرا دیر میں ہوئی لیکن جب اس پر نظر پڑی تو وہی دلکش لمبا قد، گندمی رنگ، روشن آنکھیں اور باریک مونچھیں۔ اسے لگا کہ طالب علمی کے زمانے کا بھولا بھالا، سادہ دل، تابعدار آفاق اب بھی اس کی آنکھوں کے سامنے ہے۔ اس کا دل چاہا کہ وہ اسے پاس بٹھا کر ڈھیر ساری باتیں کرے۔ لیکن پھر وہ کسی وجہ سے رک گیا، ابھی جلدی کیا ہے۔ ابھی تو بہت وقت ہے۔

گیارہ بجتے بجتے عمومی دعوت کا سلسلہ ختم ہوا، باہر کے مہمان رخصت ہوئے۔ عورتوں کے کھانے سے فارغ ہوتے ہوتے بارہ بج گئے۔ گھر کے سامنے میدان میں شامیانے کے نیچے حمید اختر، آفاق اور چند دیگر افراد بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے تھے اور تھکن اتار رہے تھے۔ حمید اختر نے جاوید کے حسنِ انتظام کی تعریف کی اور ساتھ ہی اس خوشی کا اظہار کیا کہ چلو آفاق آگئے اور ہماری تقریب کامیاب ہوگئی۔ ان کے لہجے میں تصنع نہ تھا، صاف ظاہر تھا کہ ان کے انبساط کا چشمہ رسومیات کے پہاڑوں کی وادی سے نہیں بلکہ دل سے پھوٹ رہا تھا۔

شادی میں آئے ہوئے مہمان صبح ہی سے رخصت ہونے لگے تھے۔ وہ بھی واپسی کو تیار تھا لیکن حمید اختر نے اسے روک لیا۔ دوسرے لوگوں کی طرح آفاق نے بھی رخت سفر باندھ لیا۔ اتنی مختصر ملاقات کے بعد وہ پھر بہت دور جا رہا تھا، وہاں سے اگلی بار کب آنا ہوتا۔ کچھ کہنا مشکل تھا۔ وہ تو محمود کی شادی کا معاملہ تھا جس نے اُسے شریک تقریب ہونے پر مجبور کر دیا۔ ورنہ وہ یہاں آنے والا کہاں تھا۔ آفاق کے پاس بیٹھ کر اس سے باتیں کرنے کی وہ دھیمی سی اُمنگ جو کل اس کے دل میں اٹھی تھی، اپنی جگہ پر گم ہو کر رہ گئی۔ اپنی زندگی کے ایک متنازعہ فیصلے کے سبب آفاق کو گھر آنے میں جھجک تھی اور اس پر ہمیشہ یہ خوف حاوی رہتا تھا کہ اس کے گھر لوٹ آنے سے پرانی رنجشوں میں مزید تلخی نہ پیدا ہو جائے۔ لہٰذا وہ آنے میں احتیاط برتنے لگا اور گھر کے لوگوں کی ایسی استطاعت نہ تھی کہ بار بار اتنی دور جا کر اس سے مل آئیں۔

آفاق کے جانے کے بعد گھر اُسے کچھ سونا سونا لگنے لگا۔ اس نے سوچا۔ اچھا تھا جو میں بھی آج ہی چلا گیا ہوتا۔ اگلے دن اس کی اپنی واپسی کا مرحلہ سامنے آیا۔ یہ بھی برسوں کی کھوئی ہوئی ملاقاتوں کے بعد جدائی کا کچھ مبہم مرحلہ تھا۔ گھر سے روانہ ہوتے وقت بھائی، بہنوں، ان کے بچوں، دیگر رشتے داروں اور پڑوسیوں نے اسے محبت بھری الوداع کہی۔ چند لوگ اسے اسٹیمر کے لیے ندی کے گھاٹ تک چھوڑنے آئے۔ اسٹیمر میں سوار ہوتے وقت وہ اپنے آنسوؤں کو نہ روک سکا۔ سب لوگ اُسے چاہتے ہیں...... پھر بھی اس کا دل کسی احساس زیاں سے آلودہ ہے کہ وہ خاندان کی شاخ سے ٹوٹا ہوا ایک پتہ ہے۔ مدتیں ہوئیں اس نے شاخ سے جدا زمین پر پڑے ہوئے ایک پتے کو اٹھا کر اپنی زندگی کی شاخ سے جوڑ لیا تھا۔

ابھی سہ پہر کا وقت ہے۔ وہ اپنے بیوی بچوں کے ساتھ اسٹیمر پر ہے۔ اسٹیمر گنگا ندی کو دھیرے دھیرے عبور کر رہا ہے۔ بچے دور تک پھیلے ہوئے پانی، دھندلے ہوتے ہوئے کنارے اور ندی کی لہروں سے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔ لیکن اس کے ذہن میں خیالات کا ایک کہرام برپا ہے۔ گھر

کے مختلف مناظر اس کی آنکھوں میں رقص کر رہے ہیں اور وہ حسرت و یاس سے ہر منظر کی گم ہوتی ہوئی چہل پہل کو دیکھ رہا ہے۔ پندرہ برس میں یہ پہلا اتفاق ہے کہ وہ اتنے لمبے وقفے تک گھر کے لوگوں کے ساتھ رہا۔

گھر لوٹنے میں اسے بھی ایک بندش اور ہچکچاہٹ کا سامنا ہوتا ہے۔ یہ ہچکچاہٹ ہزار کوشش کے باوجود دور نہیں ہوئی ہے۔ اس کے سامنے بہت سارے سوالات کھڑے ہو جاتے ہیں جن کا جواب اس کے پاس نہیں ہوتا۔ احساس زیاں نے اُس سے بہت کچھ چھین لیا ہے...... یا اس نے خود ساختہ جلا وطنی اختیار کر رکھی ہے؟ ورنہ وہ کیوں محض بیس پچیس کیلومیٹر کی دوری پر ندی کے اس پار بے بس کھڑا ہے۔ اُس پار اس کا گاؤں ہے۔ وہ املی کا پیڑ ہے۔ بزرگوں کے قدم گھنے مولسری کے درخت کی طرح آنگن میں سایہ فگن ہیں ...... کیا اس توانا درخت کی شاخ کٹ گئی ہے؟ مگر برسوں بعد بھی کٹے ہوئے دونوں حصوں سے یہ تر و تازہ بوندیں کیوں ٹپک رہی ہیں؟

وہ گلی

وہ ایک تنگ و تاریک گلی تھی۔ اس گلی کے دونوں طرف گندے نالے بہا کرتے تھے۔ ایک زنگ آلودہ لوہے کے کھمبے پر میونسپلٹی کا لیمپ لگا ہوا تھا جو برسوں سے جلایا نہیں گیا تھا۔ گلی میں بہت سارے چھوٹے، بوسیدہ اور بدحال مکان تھے اور ایک عالی شان عمارت کا عقبی حصہ بھی تھا۔ گلی میں داخل ہوتے ہی جو مکان سب سے پہلے ملتا، اس کی دیواریں مٹی کی بنی ہوئی تھیں۔ اس کے ماتھے پر ایک پریشان حال چھپر تھا اور دروازے پر پھٹا پرانا بوریا لٹکا رہتا تھا۔ اس بوسیدہ مکان میں کئی کمرے تھے جن میں مختلف خاندانوں کے افراد بحیثیت کرایہ دار رہا کرتے تھے۔ ایک بوڑھی عورت اس گھر کی مالکن تھی۔ وہ بیوہ تھی اور اس کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ کرایے کی آمدنی ہی سے اس کی گزر بسر ہوا کرتی تھی۔ وہ بوڑھی عورت بہت بدمزاج تھی۔ لیکن لوگ اس کی باتوں کا کبھی برا نہیں مانتے تھے۔ لوگوں کو معلوم تھا کہ اس کی زندگی نہایت تلخ گزری ہے۔ اس لیے سب لوگ اسے نظر انداز کر دیا کرتے تھے۔ اس کا شوہر کسی کارخانے میں مزدور تھا اور ایک حادثے کا شکار ہو کر عین جوانی میں اسے داغ مفارقت دے گیا تھا۔ اسے تین بچے بھی ہوئے تھے جو سنِ صغر سنی میں یکے بعد دیگرے موت کا شکار ہو گئے تھے۔ ایسے سانحات کے بعد اس کا کوئی پرسان حال نہ تھا۔ لہٰذا وہ تنہا حالات کی تند ہواؤں میں جھلس رہی تھی۔ زندگی کی تلخیوں میں گھلی ہوئی یہ بوڑھی عورت اکثر اپنے شوہر اور بچوں کو یاد کرتی اور اپنی بدنصیبی پر خوب رویا کرتی تھی۔ اس وقت اس کے کرایہ دار اسے تسلی دیتے۔ ''اماں غم نہ کرو۔ اماں روؤ نہیں۔ صبر سے کام لو۔''

اس عورت کے گھر میں جو لوگ رہا کرتے تھے۔ ان میں نثار نام کا ایک شخص تھا جو کسی موٹر گیرج میں

ملازم تھا۔ وہ رات کو تاخیر سے گھر آتا اور پھر علی الصباح اپنے کام پر چلا جاتا۔ اس کے ساتھ کام کرنے والوں میں ایک لڑکا بھی تھا جو اکثر اس کے گھر پر دستک دیتا اور کبھی پیسہ، کبھی چاول، دال، سبزی، نمک اور تیل وغیرہ اس کی بیوی کو دے جاتا۔ ایسا بھی ہوتا کہ وہ لڑکا دن بھر میں صرف ایک بار آتا اور کبھی کبھی وہ بھی نہیں۔ مگر نثار کی بیوی ہر روز دیر تک دروازے پر بیٹھی اس کا انتظار کرتی رہتی۔ یہاں تک کہ بچے روتے روتے سو جاتے۔ نثار کی بیوی اپنے کاموں سے فارغ ہو کر بوڑھی کے پاس بیٹھا کرتی اور گفتگو میں اپنا وقت گزار لیتی۔ گفتگو کا موضوع میکے کے قصے ہوتے یا پھر ماضی میں گزرے قدرے اچھے دنوں کی داستانیں۔ اس وقت بوڑھی کا غم کچھ ہلکا ہو جاتا اور اس کے جھریوں بھرے چہرے پر مسکراہٹ کی ہلکی سی چمک دکھائی پڑ جاتی۔ لیکن ایسے لمحے بہت مختصر ہوتے اور جلد ہی دونوں زندگی کی اداس راہوں میں گم ہو جاتیں۔ بوڑھی کہتی۔ ''بیٹی! اب دور کی چیزیں دکھائی نہیں پڑتی ہیں۔'' نثار کی بیوی جواب دیتی۔ ''اماں کسی ڈاکٹر سے آنکھیں دکھالو۔'' بوڑھی جواب دیتی۔ ''اتنے پیسے کہاں ہیں بیٹی!'' کبھی نثار کی بیوی اپنا غم سناتی۔ ''بچے کو بخار ہے۔ دوا کے لیے پیسے نہیں ہیں۔ آج وہ لڑکا بھی نہیں آیا ہے۔'' کچھ دیر کے بعد بوڑھی عورت خاموشی توڑتی۔ ''ہاں بیٹی! ہم لوگوں کی زندگی دکھوں سے بھری ہوئی ہے۔''

بوڑھی کے گھر کی بغل میں جو مکان تھا۔ وہ بھی مٹی کا بنا ہوا ایک چھوٹا سا کمرہ تھا۔ اس میں ایک اپاہج بوڑھا بھکاری رہا کرتا تھا۔ وہ برسوں قبل رکشہ چلایا کرتا تھا۔ لیکن عالم شباب ہی میں کسی مہلک بیماری کا شکار ہو کر اپنے پیروں کی طاقت گنوا چکا تھا۔ اس وقت اس کی رفیق اس کی بیوی تھی جو اس کے اپاہج ہو جانے کے کچھ دنوں بعد تک اس کی خدمت کرتی رہی۔ لیکن خود ہی کسی مرض کا شکار ہو کر مر گئی۔ اپاہج ہو جانے کے بعد اس کا دل چاہا تھا کہ وہ اپنی روزی محنت سے حاصل کرے۔ لیکن جب صحت مندوں کی روزی کا ٹھکانہ نہیں تو بے چارے معذور کو کام کہاں سے ملتا۔ مجبوراً اس نے کشکول کا سہارا لیا۔ وقت کے ساتھ اس کی صحت اور بھی گر گئی تھی۔ اسے بخار رہنے لگا تھا۔ کھانسی

کے دورے بھی پڑنے لگے تھے۔ جس روز اس کی طبیعت قدرے بہتر ہوتی اس روز وہ کہیں سے کچھ مانگ لاتا لیکن جب مرض کی شدت ہوتی تو وہ اپنے گھر ہی میں پڑا رہ جاتا۔

اس گلی میں ذرا اندر کی طرف ایک اور چھوٹا سا مکان تھا۔ جس میں کسی دفتر کا ایک چپراسی رہا کرتا تھا۔ اکثر رات کو دیر تک اس کے دروازے پر دستک کی آواز اور بک جھک کا شور سنائی پڑتا۔ مالک مکان، بنیے اور دھوبی وغیرہ اپنے اپنے بقایوں کی وصولی کے لیے اس کے یہاں آتے رہتے تھے۔ اس کا بیٹا اسکول میں پڑھتا تھا۔ وہ دبلا، پتلا، بالکل زرد رولڑکا تھا۔ پھٹے پرانے کپڑوں میں ننگے پیر اسکول جاتا۔ لوگ پوچھتے۔ ''تم چپل کیوں نہیں پہنتے ہو؟'' لڑکا جواب دیتا۔ ''اگلے مہینے ابا چپل خرید دیں گے۔'' مگر اگلے مہینے بھی وہ ننگے پیر ہی اسکول جاتا۔ چپل خریدنے والا مہینہ اس کے لیے کبھی نہیں آتا۔ کچھ دنوں کے بعد اس کی پڑھائی کا سلسلہ منقطع ہوگیا تھا۔ وہ دسویں کلاس میں تھا کہ ایک روز اس کے والد نے اس سے کہا۔ ''بیٹا! میری مختصر سی آمدنی میں گھر کے اخراجات پورے نہیں ہوتے۔ اس لیے تم پڑھائی چھوڑ کر کسی کام میں لگ جاؤ۔ میں تمہارے لیے کوئی کام ڈھونڈ دوں گا۔'' بیٹا خاموش رہ گیا تھا۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا تھا اور اداس نظروں سے اپنے والد اور طاق میں رکھی اپنی کتابوں کو دیکھا تھا۔ والد کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔

گلی میں رہنے والے مختلف خاندانوں میں ناچاقی بھی رہا کرتی تھی۔ وہ لوگ جھگڑے بھی کیا کرتے تھے۔ لیکن جلد ہی میل ملاپ بھی کر لیتے۔ اس لیے کہ ان کے دکھ، ان کے مصائب اور ان کی خوشیاں مشترکہ تھیں۔ درد وغم کا آپسی رشتہ انھیں یکجا کیے رہتا۔ وہ گلی فقط ان لوگوں کی آمد ورفت کا راستہ ہی نہیں تھی بلکہ وہاں رہنے والوں کے لیے مشترکہ آنگن بھی تھی۔ آنگن جہاں کہ وہ لوگ تھوڑی دیر بیٹھ کر اپنے دکھ سکھ کی باتیں کر لیتے۔ اپنے لوگوں کے ساتھ رنج ونشاط کی باتیں کرنا تلخی بھی دیتا ہے اور خوشیاں بھی۔ وہ گلی ان گھروں کے بچوں کے کھیلنے، لڑنے جھگڑنے، رونے دھونے، گالی گلوج کرنے اور پھر شدت بھوک سے تڑپنے کی جگہ بھی تھی۔ ان بھوکے ننگے بچوں کے

لیے کہیں کوئی اسکول نہیں تھا۔ کتابیں نہیں تھیں۔ کتابوں کے زندگی آشنا الفاظ سے وہ لوگ محروم تھے۔ نہ ہی ان لوگوں کے لیے روزی روزگار جیسا کوئی کام تھا۔ بس دن بھر وہ لوگ گلی میں گزار دیتے۔ اس گلی میں رہنے والوں کے لیے جیسے زمین تنگ تھی۔ ہر جانب مایوسی کے کالے کالے بادل تھے۔ بوجھل چاند اور سورج تھے۔ بجھتے ہوئے اداس اور پژمردہ ستارے تھے۔

گلی میں جس عالی شان عمارت کا عقبی حصہ تھا۔ اس میں بہت سارے کمرے اور ان کے نیچے گہرے تاریک تہہ خانے تھے۔ جس میں پتہ نہیں کیا کچھ بند تھا۔ اس وسیع عمارت کے سامنے ایک بڑا سا احاطہ تھا۔ عمارت میں ایک آہنی دروازہ لگا ہوا تھا۔ رنگ برنگ کی موٹر گاریاں عمارت کے احاطے میں کھڑی رہتیں۔ شہر کے امیروں، اعلیٰ عہدے داروں اور عوامی نمائندوں کی آمدورفت ہمیشہ جاری رہتی۔ اس عالی شان عمارت کی مالکن ایک فربہ اندام عورت تھی جو اکثر اپنی عمارت کی چھت پر کھڑی رہتی وہ کبھی کبھی عقب والی گلی کی تمام چیزوں کو ناک بھنویں سکوڑ کر دیکھ لیا کرتی تھی جہاں وہ بوڑھی عورت، نثار کی بیوی، اپاہج بوڑھا بھکاری اور ایسے ہی دوسرے بھوکے ننگے بدحال لوگ رہا کرتے تھے۔ یہ تمام لوگ اس امیر اور فربہ اندام عورت کے لیے قابل نفرت تھے۔ اس عمارت کی مالکن اور گلی کے مکیں کے درمیان کوئی ربط یا تعلق نہیں تھا۔ زندگی کے کسی بھی موڑ پر وہ آپس میں نہیں ملتے تھے۔ ان کے درمیان پڑوس پن بالکل اجنبی لفظ تھا۔ ایک فریب، بالکل سراب جیسا۔

وقت گزرتا گیا۔ لیکن اس گلی میں کبھی روشنی نہیں آئی۔ وہ گلی اندھیری کی اندھیری رہ گئی۔ سورج کا اُجالا، چاند کی چاندنی، تاروں کی جھلملاہٹ، ان سبھوں کو وہ عالی شان عمارت، اپنی اونچی دیواروں سے روکے رکھتی۔ وہ گلی ابھی تک اندھیری ہے۔ وہاں زندگی کی روشنی اب تک نہیں پہنچی ہے۔ ....اور اس گلی کے ڈانڈے ایسی بے شمار گلیوں سے جا ملے ہیں۔

زہر

اسپتال کی عمارت سے باہر نکل کر وہ سامنے کے چوراہے پر کھڑا ہے۔ دوپہر کا وقت ہے۔ سورج سوا نیزے پر ہے۔ اس کی ضیا پاش کرنیں چاروں طرف بکھر رہی ہیں اور ہر شے روشنی میں دمک رہی ہے۔ لیکن نظروں کو خیرہ کر دینے والے اس اُجالے میں بھی اسے تاریکی ہی نظر آ رہی ہے۔ جس چوراہے پر وہ کھڑا ہے وہاں سے کئی راستے زندگی کے ہنگاموں کی جانب پھوٹ رہے ہیں زندگی سے ہم آہنگ خلقت ان راستوں پر رواں دواں ہے۔ لیکن اس کے لیے تو اب زندگی کے سارے راستے مفقود ہو چکے ہیں۔ صرف ایک راستہ وا ہے۔ تباہی و بربادی کا۔ یہاں تک کہ رسوائی کی موت کا یہ سوچ کر وہ کانپ جاتا ہے۔

وہ آگے بڑھنا چاہتا ہے۔ لیکن اس کے پیر کانپ رہے ہیں اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ اس کی زندگی کا ایسا بھیانک انجام ہوگا۔ وہ چوراہے پر کھڑا سوچ رہا ہے کہ دفتر جائے یا گھر؟ دفتر سے تو اس نے آج فرصت لے رکھی ہے اور گھر کی یاد آتے ہی وہ سر پکڑ لیتا ہے۔ اُف خدا! اب وہاں میرے لیے بچا بھی کیا ہے؟ وہ چوراہے پر بیٹھ جانا چاہتا ہے۔ اس کے اندر خواہش مرگ پیدا ہوتی ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ کوئی تیز رفتار گاڑی اسے کچل دے اور وہ چیتھڑا چیتھڑا ہو کر بکھر جائے۔ اس وقت کم از کم لوگوں کی ہمدردی تو اس کے ساتھ رہے گی۔ نفرت اور رسوائی کا سامان تو اس کے نام کے ساتھ باقی نہیں رہے گا۔ وہ خودکشی کرنے کے متعلق بھی سوچتا ہے۔ لیکن اس کام کے لیے حوصلہ چاہیے۔ شاید اس کے پاس اتنا حوصلہ نہیں ہے۔

اس کا ذہن گھڑی کے کانٹے کی طرح گھوم رہا ہے۔ اس کی الجھنیں بڑھتی جا رہی ہیں۔ وہ

کہاں جائے؟ اور کس سے اپنی کیفیت کا اظہار کرے؟ یہ سوالات اس کے ذہن میں چبھ رہے ہیں۔ آخر تھک ہار کر وہ ایک طرف مڑتا ہے۔ دھیرے دھیرے چل کر تھوڑی دور واقع ایک پارک میں داخل ہوتا ہے۔ دوپہر کا وقت ہونے کی وجہ سے پارک تقریباً خالی ہے۔ بس چند لوگ اِدھر اُدھر بیٹھے ہیں۔ وہ ان لوگوں کو بغور دیکھتا ہے۔ اُسے اطمینان حاصل ہوتا ہے کہ ان میں ایک بھی چہرہ شناسا نہیں ہے۔ شناسا لوگوں سے روبرو ہونے کی اس میں فی الوقت قوت باقی نہیں بچی ہے۔ ادھر کچھ دنوں سے وہ بیمار جا رہا ہے۔ اس کا وزن گھٹ رہا ہے۔ بخار کی کی کیفیت رہتی ہے وہ راتوں کو اچانک اٹھ کر بیٹھ جاتا ہے اور دیر تک دوبارہ نیند سے محروم رہتا ہے۔ ان باتوں کے علاوہ ابھی ملی رپورٹ نے اس کی زیست کی بنیادوں کو ہلا ڈالا ہے۔ وہ چاروں طرف نظر دوڑاتا ہے۔ پارک کے ایک کونے میں کئی چھتنار پیڑ ہیں جس کے خزاں آلودہ پتے ٹہنیوں سے علاحدہ ہو کر زمین پر گر رہے ہیں۔ ان پیڑوں کے ارد گرد خاروخس بھی اُگے ہوئے ہیں۔ وہ اسی کونے میں بیٹھ جاتا ہے اور پھر وہیں دوب پر لیٹ جاتا ہے۔ وہ لمبی لمبی سانسیں لیتا ہے اور کھلے آسمان کو تکنے لگتا ہے آسمان میں پرواز کرتے پرندوں پر اس کی نگاہیں جاتی ہیں۔ پرندے فضا میں پرواز کر رہے ہیں۔ کھلا آسمان ان کی مٹھیوں میں نظر آتا ہے۔ یہ دیکھ کر اسے اپنی مجبوریوں کا احساس ہوتا ہے۔ وہ اب کبھی زندگی کے آسمان میں پرواز نہیں کر سکے گا۔

وہ اس کاغذ کے ٹکڑے کو دوبارہ دیکھتا ہے۔ جو ابھی کچھ دیر قبل اُسے ملا ہے۔ اسے محسوس ہوتا ہے کہ کاغذ کے ٹکڑے پر ثبت الفاظ پگھل رہے ہیں۔ یہ کسی زخم کا گھناؤنا اور بدبودار مواد معلوم ہوتا ہے۔ اس پیپ میں اس کا وجود سڑتا ہوا نظر آتا ہے۔ اس میں کچھ اور بھی چہرے اُبھرتے ہیں۔ وہ ان کا تعاقب کرتا ہے۔ اُسے یاد آتا ہے کہ وہ اپنے دفتر کے کاموں کے سلسلے میں مختلف شہروں کا دورہ کیا کرتا تھا۔ کبھی کولکاتہ، کبھی ممبئی، کبھی حیدرآباد اور کبھی دہلی اور ہر جگہ وہ اپنی جنسی بے راہ روی کی محفلیں آباد کرتا تھا۔ روما، فردوس، انورادھا، مس روزا، اور نہ جانے کتنی ایسی لڑکیاں اس کی زندگی

میں آئی تھیں۔ اس نے رک کر منتشر خیالات کو ایک نکتے پر مرکوز کرنا چاہا۔ چھ سات مہینے قبل وہ دہلی گیا ہوا تھا۔ ریلوے اسٹیشن سے باہر نکل رہا تھا کہ اس کی شکاری نظر ایک لڑکی پر پڑی تھی جو خوب صورت تو ضرور تھی لیکن عام صحت اس کی درست نظر نہیں آ رہی تھی، پھر بھی وہ اس کی طرف متوجہ ہوا تھا۔ وہ لڑکی بھی تو اس قبیل کے مردوں کی منتظر تھی، وہ فوراً مائل ہوگئی اور اس کے ساتھ کسی مخصوص مقام پر جانے کے لیے تیار ہوگئی تھی۔

وہ لڑکی اس کے ذہن میں رقص کرنے لگتی ہے۔ اس نے اس کا نام بھی دریافت نہیں کیا تھا۔ بس ایک ہوٹل میں جہاں کہ اس کا قیام طے تھا۔ وہ تھوڑی دیر تک اس کے ساتھ رہی تھی۔ وہ لڑکی جب اس سے جدا ہوئی تھی تو وہ بہت مایوس ہوا تھا۔ زندگی میں پہلی بار اسے بے لطفی کا احساس ہوا تھا۔ پھر بھی وہ اپنے اندیشے کو حتمی طور پر اس لڑکی سے منسلک نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے کہ ظاہری طور پر کچھ ایسا تھا بھی نہیں۔ اگر وہ مصیبت زدہ تھی اور اس کے اندیشوں کا سبب بن گئی تھی تو اس کے دکھ کا بھی تو کوئی ذمہ دار ہوگا۔ اُسے اس لڑکی پر غصہ نہیں آتا ہے بلکہ اُسے اپنے آپ سے نفرت ہونے لگتی ہے۔ رفتہ رفتہ وہ لڑکی اس کے ذہن کے دریچوں سے اوجھل ہو جاتی ہے اور دوسرے واقعات ابھرنے لگتے ہیں۔ تلذذ کی گلیاں تو اس کی زندگی میں بے شمار ہیں۔ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ دیر تک ان میں بھٹکتا رہتا ہے۔

دھوپ اب سمٹنے لگی ہے۔ پارک میں پیڑوں کے سایے لمبے ہونے لگے ہیں۔ وہ دیر سے یوں ہی بھوکا پیاسا پڑا ہوا ہے۔ یادوں کے نوکیلے کانٹے اسے مہلت نہیں دے رہے ہیں۔ وہ خود سے سوال کرتا ہے۔ کیا انسان پیدائشی طور پر بے راہ روی کا شکار ہوتا ہے؟ کیا وہ دوسرے بچوں کی طرح معصوم نہیں تھا؟ کیا ایک بھری پری زندگی گزار کر طبعی موت سے ہم کنار ہونے کا اسے حق حاصل نہیں تھا؟ اس کی بیوی ابھی جوان ہے، بچے اس کے چھوٹے ہیں۔ کیا یہ اس کے مرجانے کی عمر

ہے؟ تو پھر ایسا کس طرح ہو گیا۔ کہاں پر کمی رہ گئی؟ کس نے اُسے اس راستے پر ڈال دیا؟ اسے یاد آتا ہے کہ لڑکپن ہی میں یہ عفریت اس کے وجود میں داخل ہو گیا تھا۔ تب سے آج تک وہ ہوس کے ہم راہ دوڑتا رہا ہے۔ اس دوڑ میں اس نے ٹھوکریں بھی کھائی ہیں۔ ذلت و رسوائی کا بھی اسے سامنا کرنا پڑا ہے۔ لیکن پھر بھی وہ اپنی حرکتوں سے کبھی باز نہیں آیا ہے۔ وہ اپنے سوالوں کا خود ہی جواب دیتا ہے۔ شاید اس کی پرورش و پرداخت میں کچھ کمی رہ گئی تھی، جس کی وجہ سے اُس میں منفی رویے رونما ہو گئے ہیں۔ اس منفی رویے نے اسے جنسی جرائم کی طرف مائل کیا ہے اور وہ لڑکپن ہی سے بے راہ روی کا شکار ہے۔

اس نے ایک آہ سرد بھری ہے۔ اس کے ذہن میں دوبارہ کئی سوالات اُبھرتے ہیں۔ جب وہ بڑا ہوا تو اس نے اپنی منتشر زندگی کا احتساب کیوں نہیں کیا؟ اس نے اپنی زندگی کو نعمت تصور کیوں نہیں کیا؟ زندگی بھی چمن بندی کھوجتی ہے۔ اس کی تعمیر بھی ایک خوب صورت اور عالی شان عمارت کی طرح ہونی چاہیے۔ وہ ہمیشہ کا بدنصیب ثابت ہوا ہے۔ اس کا باپ اس سے ہمیشہ ناراض رہا کرتا تھا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ آگے پتہ نہیں اس لڑکے کا کیا ہوگا؟ یہ ذرا بھی دور اندیش نہیں ہے۔ ماں بھی اس کی حرکتوں پر کڑھا کرتی تھی۔ وہ اس وقت اپنے باپ کو یاد کرتا ہے۔ جس کی بڑی آرزو تھی کہ وہ نیک انسان بنے۔ اُسے ماں باپ، بھائی بہن، بیوی اور دوسرے رشتے دار یاد آتے ہیں۔ سب نے متعدد بار اس کی اصلاح کی کوشش کی تھی۔ کیا اُسے اپنی زندگی کو درست کر لینے کا ایک موقع اور مل سکتا ہے؟ اس نے بے بسی سے سوچا۔ لیکن ذہن میں صدائے بازگشت گونجتی ہے۔ وقت اس کے کانوں میں چیخ رہا ہے اور اس کی سماعت پارہ پارہ ہو رہی ہے۔ کیا گزرا ہوا زمانہ کبھی واپس آتا ہے؟ ماضی کا دروازہ کیا کبھی وا ہو سکتا ہے؟ پیوند خاک ہوئے والدین کی شفقت و محبت، آدھی عمر کی دہلیز پر کھڑے انسان کو کیا دوبارہ مل سکتی ہے؟ وہ پریشان ہو جاتا ہے اور مایوس ہو کر تاریکی میں جھانکنے لگتا ہے۔

وہ اٹھ کر بیٹھ گیا ہے۔ شام رخصت ہو چکی ہے۔ رات کا سایہ چاروں طرف پھیل چکا ہے۔ ملازم اب پارک کو بند کرنا چاہتا ہے۔ یہ دیکھ کر وہ پارک سے نکل جاتا ہے۔ شہر کی رات برقی قمقموں سے رونق افروز ہے۔ سڑکوں پر کاروں کی زنجیریں بنی ہوئی ہیں۔ ان کی روشنیاں آنکھوں کو چکا چوندھ کر رہی ہیں۔ لیکن اس کی آنکھیں تو فیوز ڈ بلب کی طرح ناکارہ ہو چکی ہیں۔ بازار کی رونق، دکانوں کی بھیڑ اور راہوں میں مچلتی جوانیاں اسے اب کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا ہے۔ وہ ایک چائے کی دکان کے پاس رکتا ہے۔ ایک کپ چائے پیتا ہے اور دیر تک بازار میں بھٹکتا رہتا ہے۔ جب روشنیاں گل ہونے لگتی ہیں اور ہنگامے سرد ہونے لگتے ہیں تو وہ ایک چوراہے پر آ کھڑا ہوتا ہے۔ ان میں ایک راستہ اس کے گھر کی طرف بھی جاتا ہے۔ وہ کس طرف جائے؟ یہی وہ سوچ رہا ہے۔ اسے اپنی خوب صورت اور باوفا بیوی یاد آتی ہے جس کے ساتھ وہ مستقل ریا کرتا رہا ہے۔ چھوٹے چھوٹے بچے یاد آتے ہیں۔ وہ کس طرح ان لوگوں کا سامنا کرے گا؟ بہر کیف وہ ڈگمگاتے قدموں سے گھر کی راہ اختیار کرتا ہے۔ اس وقت اسے لڑکپن کا زمانہ یاد آ جاتا ہے۔ وہ جھڑکیوں کے خوف سے، گھر تاخیر سے واپس آتا تھا اور چوری چھپے گھر میں اس وقت داخل ہوتا تھا۔ جب سب لوگ سو چکے ہوتے تھے۔ اس کی بڑی بہن اس کے لیے طاق میں کھانا رکھ دیا کرتی تھی۔ آج بھی وہ کچھ اسی طرح گھر میں داخل ہونا چاہتا ہے۔ داخل ہوتے ہی اسے یاد آتا ہے کہ آج اس کی شادی کی دسویں سال گرہ ہے اور اس موقعے پر اس کی بیوی نے اپنی چند سہیلیوں کو مدعو کر رکھا ہے۔ لیکن اس وقت بچے سو چکے ہیں۔ بیوی کی سہیلیاں واپس جا چکی ہیں۔ میز پر شادی کی سال گرہ کا کیک بس یوں ہی پڑا ہوا ہے۔ بیوی دروازے کے پاس بیٹھی اس کا انتظار کر رہی ہے۔ اس کے چہرے پر پریشانیوں کی لکیریں اُبھر آئی ہیں۔ وہ اسے دیکھ کر روہانسی ہو جاتی ہے۔ آپ کہاں تھے؟ آپ نے اتنی دیر کیوں کر دی؟

لیکن وہ خاموش ہے۔ وہ کوئی جواب نہیں دیتا ہے۔ بیوی پھر کہتی ہے۔

''میری سہیلیوں نے آپ کا بہت انتظار کیا، وہ پھر چلی گئیں۔''

پھر بھی وہ خاموش رہ جاتا ہے۔ بیوی دوبارہ پوچھتی ہے۔

''اورآپ کے ہاتھ خالی ہیں۔ آپ نے میرے لیے کوئی تحفہ نہیں لایا۔''

بیوی کی باتوں سے وہ جھنجھلاہٹ کا شکار ہوتا ہے اور تقریباً چیختا ہوا کہتا ہے۔

''تم تحفہ کی بات کرتی ہو۔ افسوس ہے کہ میں نے اپنی زندگی میں زہر بولیا ہے اور خدا جانے تمہارا بھی اس وقت کیا حال ہے''؟'' اسے دکھ بھی ہوتا ہے کہ وہ اپنی معصوم بیوی کو اتنی تلخ باتیں کیوں کہہ رہا ہے؟ وہ اپنے چہرے کو ہاتھوں سے چھپالیتا ہے۔ سینے میں پیدا کرب کی لہروں کو جھیلتے ہوئے کمرے میں داخل ہوتا ہے اور بستر پر دراز ہو جاتا ہے۔ وہ رونا چاہتا ہے لیکن اس کی آنکھیں خشک ہیں۔ یوں دل پھٹا جا رہا ہے۔ لیکن آنکھیں نم ناک نہیں ہو پا رہی ہیں۔ وہ خلا کو تاکنے لگتا ہے۔

اس کی بیوی بھی اس کے پیچھے پیچھے کمرے میں داخل ہوتی ہے۔ وہ اس کی پریشانی کا سبب دریافت کرتی ہے۔ وہ جواب دیتا ہے۔ ''سلمٰی! میں ایچ آئی وی پوزیٹیو ہو گیا ہوں۔'' سلمٰی یہ بات سن کر پریشان ہو جاتی ہے۔ وہ اپنے شوہر سے کہتی ہے...... ''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔'' وہ کسی طرح جیب میں ہاتھ ڈالتا ہے اور رپورٹ نکال کر بیوی کی طرف بڑھا دیتا ہے۔ بیوی کاغذ کے اس ٹکڑے کو بغور دیکھتی ہے اور سر پکڑ کر وہیں بیٹھ جاتی ہے۔ اس کے دل میں ویرانیوں کے بگولے اٹھتے ہیں۔ من کے جھروکے خزاں رسیدہ پتوں سے اٹ جاتے ہیں۔ وجود اس کا لرزنے لگتا ہے۔ وہ بدبدانے کے انداز میں صرف اتنا گویا ہوتی ہے۔

''آپ کی جو روش تھی۔ اس کا انجام تو کچھ ہونا ہی تھا۔''

زرد ماهتاب

آج میں تمام دن تھکا تھکا سا گھر میں پڑا رہ گیا ہوں۔ دوپہر ہوئی ہے تو اب ڈاکیے کا انتظار کرنے لگا ہوں۔ آج کی ڈاک سے میرے بھائی کے نام ایک انٹرویو لیٹر آیا ہے۔ میں نے چاہا ہے کہ لفافے کو چاک کر کے دیکھوں۔ لیکن میرے حوصلے نے اس عمل میں میرا تعاون کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ میں سراب آلودہ الفاظ دیکھتے دیکھتے تھک چکا ہوں۔ میں نے لفافے کو میز پر رکھ دیا ہے اور کرسی کی پشت پر ٹیک لگا کر آنکھیں موند لی ہیں۔ مجھ پر ایک عجیب سی اضطراری کیفیت طاری ہو گئی ہے۔ یہ لفافہ کسی عقرب کی طرح میرے ذہن میں ڈنک مار رہا ہے۔ اس لفافے نے میرے تخیل کی سطح آب پر سنگ ریزے ڈال دیے ہیں۔ جس سے میرے ذہن میں گرداب کا حلقہ وسیع سے وسیع تر ہوتا جا رہا ہے۔

لفافہ میز پر پڑا ہے۔ اس پر میرے بھائی کا نام جلی حروف میں لکھا ہوا ہے جو دور ہی سے نظر آ رہا ہے۔ ذہن میں ایک عجیب سی ہلچل مچی ہوئی ہے۔ ایک طوفان سا برپا ہے۔ بھائی کے نام کے حروف دھندلے پڑتے جا رہے ہیں۔ روشنائی الفاظ کے جسم سے نکل کر کاغذ پر پھیل رہی ہے۔ گویا ایک دریا سا اُمڈا جا رہا ہے۔ اس کی اچھلتی کودتی موجوں میں بھائی کی صورت ابھرتی ہے۔ نکلتا قد، صحت مند جسم، تیکھے نقوش اور بالکل صاف رنگ۔ ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ یہ چہرہ ابھی اسکول سے پاس کر کے کالج میں سال اول کے طالب علم کا ہے۔ گھر قصبے میں ہے۔ جہاں ابھی تک ایک بھی کالج نہیں ہے۔ کالج قصبے سے بیس کیلومیٹر کے فاصلے پر شہر میں واقع ہے۔ اس نے وہیں داخلہ لے لیا ہے۔ قصبے کے زیادہ تر لڑکے روزانہ گھر ہی سے کالج جاتے ہیں۔ وہ علی الصباح نیند

سے بیدار ہوتا ہے۔ روزمرہ کے معمولات سے فارغ ہوتا ہے۔ صاف اور خوش رنگ کپڑے پہنتا ہے جو اس کے صحت مند جسم پر خوب جچتے ہیں۔ کپڑے تو صحت مند جسم پر ہی خوش نما معلوم ہوتے ہیں۔ پڑوس کے لڑکے اس کو ساتھ لینے آتے ہیں اور پھر سب مل کر اسٹیشن کی طرف لپکتے ہیں۔ کبھی ٹرین سے، کبھی بس سے، یہ لوگ شہر کے لیے روانہ ہوتے ہیں۔ کبھی بہت آسانی سے بیس کیلومیٹر کا مختصر سفر طے ہو جاتا ہے اور کبھی یہ سفر ہزاروں میل لمبی رات میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ دن بھر لڑکے کالج میں مصروف رہتے ہیں۔ شام کے وقت بھوکے پیاسے گھر لوٹتے ہیں۔ اس وقت بھائی کا چہرہ بالکل تھکا ماندہ نظر آتا ہے۔ روزانہ کا سفر اس کے چہرے کی رمق کو اس کی تازگی و رعنائی کو بالکل نچوڑ لیتا ہے اور خوش رنگ چہرے پر تکان کی زردی چھا جاتی ہے۔ ہاں جب امتحانات کے دن قریب آتے ہیں تب اس کے لیے شہر میں رہنے کا عارضی انتظام کر دیا جاتا ہے۔ امتحانات کے بعد گوریے کے گھونسلے کی طرح یہ ٹھکانہ بھی چھوٹ جاتا ہے۔ آنکھوں میں خواب سجانے کی یہی عمر ہوتی ہے۔ بھائی کی آنکھوں میں بھی خواب پرورش پاتے ہیں۔ سرخ، سفید اور نیلے رنگوں کے خواب۔ کسی میں امتحانات میں کامیاب ہونے کی خوش بو ہے۔ کسی میں اچھی ملازمت حاصل کرنے کی امنگ تو کسی میں آراستہ زندگی کے نقش و نگار اور چند رنگ ایسے بھی ہیں جن کی صورتیں ابھی نمایاں نہیں ہیں۔

چہرے کے مختلف رنگ و روپ سامنے ہیں۔ خوشی کے، غم کے، دھوپ کے، چھاؤں کے اور نشیب و فراز کے۔ الفاظ بے حوصلہ ہو رہے ہیں ان کے اظہار میں۔ یہ نوخیز لڑکے کسی دوسرے شہر جا رہے ہیں۔ وہاں این سی سی کا کیمپ لگنے والا ہے۔ میرا بھائی بھی ان میں شامل ہے۔ اس کے قد و قامت پر، اس کے تیکھے نقوش پر، اسکی روشن آنکھوں پر، اس کے پر حوصلہ دل پر، اس کی پاٹ دار آواز پر، این سی سی کی پوشاک بہت پج رہی ہے۔ وہ ان لڑکوں میں منفرد اور ممتاز نظر آ رہا ہے۔ جیسے پرندوں

کے جھنڈ میں سارس اور جنگل میں ساگوان ہوتا ہے۔ میں نے ذرا رک کر ان امیدوں کے پرندوں کو دیکھنا چاہا ہے۔ میں نے کافی دیر تک ان لڑکوں کو دیکھا ہے۔ کاش! میری پتلیاں اس حسین منظر کو سدا کے لیے محفوظ کرلیں۔ یہ امیدوں کے پرندے آسمان کی وسعتوں کو حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ ان کے حوصلے ابھی جوان ہیں۔ ان کی امنگیں فروزاں ہیں۔ ان کی رگوں میں تازہ، گرم، سرخ لہو دوڑ رہا ہے۔ جس کی حرارت سے وہ تمام مشکلات کو سہل بنا دینا چاہتے ہیں۔ ان کے چہرے پر وہ تاب ناکی ہے جو ہاتھ بڑھا کر سورج کو مٹھی میں قید کر لینے کے حوصلے اور امنگوں سے پیدا ہوتی ہے۔ وہ ابھی عقاب صفت ہیں اور خوف و ہراس کے موسم کے باوجود شکستہ پر ہونا نہیں چاہتے، بلکہ پرواز کرتے رہنا چاہتے ہیں، تاکہ ایک دن قوس قزح کی کمان انھیں آسمان کے نیل گوں دامن میں کہیں نہ کہیں نظر آجائے۔ میں ان لوگوں کے لیے دعا مانگتا ہوں۔ یا خدا! یہ ہاتھ ہیں، انھیں قوت دیجیے۔ یہ دل ہیں انھیں حوصلہ دیجیے۔ یہ آنکھ ہیں انھیں نظر دیجیے۔ یہ برسات ہیں، انھیں طاؤس دیجیے۔ یہ آسمان ہیں انھیں دھنک دیجیے۔ یا خدا......

وقت گزر رہا ہے۔ وقت کا شفق کی سرخیوں سے رشتہ قائم ہے۔ چاند اپنے ہالے میں قید ہے۔ ستاروں کی جھلملاہٹ باقی ہے۔ مینہ اپنے نرم اور پھوار بھرے ہاتھوں سے کائنات کو نہلا رہا ہے۔ کائنات دھلی دھلی نظر آرہی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس نے ہریالی کی ردا اوڑھ لی ہے۔ میری اداس آنکھیں گزرتے لمحوں کے سبزے کی اس بہار کو اپنی آنکھوں میں محفوظ کر لینا چاہتی ہیں۔ میرا بھائی شاداں و فرحاں، زندگی کے نشیب و فراز میں پا بہ جہد ہے۔ اس کی فائل میں اسکول سے لے کر یونی ورسٹی تک کی ڈگریاں محفوظ ہو چکی ہیں۔ اس کا سینہ مختلف کتابوں کے علم سے معمور ہے۔ اب وہ ان ڈگریوں کو لے کر تلاش معاش میں سرگرداں ہے۔ وہ مختلف دفتروں کی سیڑھیاں چڑھ اتر رہا ہے۔ روزانہ مختلف اخباروں کا مطالعہ کرتا ہے۔ ان میں اشتہارات ڈھونڈتا ہے۔ کچھ مل جاتا ہے تو

اس کی آنکھیں منور ہو جاتی ہیں اور نہیں ہوتا ہے تو اس کی آنکھیں مایوسیوں کی سیاہ ڈوریوں سے ڈھک جاتی ہیں۔ پھر وہ عرضیاں ارسال کرتا ہے اور کتابوں میں محو ہو جاتا ہے۔ انٹرویو لیٹرز آتے ہیں۔ وہ دوڑتی بھاگتی ریلوں میں دھکے کھاتے ہوئے دور دراز کا سفر کرتا ہے۔ ذہن میں امیدوں کی تتلیاں آس کے رنگ بھرنے لگ جاتی ہیں۔ لیکن آخر کتنے دنوں تک؟ ادھر ایک گہری خاموشی چھائی رہتی ہے۔ کوئی جواب نہیں آتا ہے کوئی مکالمہ نہیں ہوتا ہے۔ ایک تو مواقع بہت کم ہیں۔ بعد میں معلوم ہوتا ہے کہ سفارشوں اور رشوتوں کی قتل گاہوں میں مستحقین کے حقوق کو قربان کر دیا گیا ہے۔ بھائی مایوس ہو جاتا ہے۔ وہ کئی روز تک کمرے سے باہر نہیں نکلتا ہے یا شہر کے ویرانوں میں بھٹکتا رہتا ہے۔ کوئی اس کے درد و کرب کو محسوس کرے یا نہیں، میری نگاہیں تو محسوس کر لیتی ہیں۔ درد و غم کا آپسی رشتہ ایک دوسرے کے جذبات کو محسوس کرنے میں آسانیاں فراہم کرتا ہے۔ میں اس درد کو دل کے نہاں خانوں میں اپنے درد کی طرح محسوس کرتا ہوں اور ان کرب ناکیوں کو یوں جھیلتا ہوں جیسے میرے ساتھ ہی کوئی ستم ہوا ہے۔

اف! میں کس قدر بھٹک گیا ہوں۔ محض ایک لفافے نے مجھے اس طرح الجھا دیا ہے کہ میں اس کے حصار سے نکل نہیں پا رہا ہوں۔ میں آخر ان لوگوں میں کیوں شامل نہیں ہوں جو اپنے گرد و پیش سے لاتعلق ہو کر انتہائی پرسکون اور پرمسرت انداز میں زندگی کے شب و روز گزار رہے ہیں۔ نہیں نہیں...... میں کسی دوسرے کے لیے فکر مند نہیں ہوں۔ میں کسی اور کے لیے نہیں رو رہا ہوں۔ کون روتا ہے کسی اور کی خاطر؟ میں تو خود پر رو رہا ہوں۔ مجھے گزرے ہوئے ایام یاد آ گئے ہیں۔ میں اس وقت بہت کچھ اور بھی یاد کرنا چاہ رہا ہوں کہ دروازے پر دستک ہوتی ہے۔ بھائی کہیں باہر گیا ہوا تھا۔ اب وہ لوٹ آیا ہے۔ میں دروازہ کھولتا ہوں اور بھائی کے چہرے کو بغور دیکھتا ہوں۔ میری آنکھوں میں برق رقص کرتے ہیں۔ کبھی آنکھیں روشن ہوتی ہیں اور کبھی گل ہو جاتی ہیں۔ کبھی روشنی ہوتی ہے اور کبھی تاریکی۔ این سی سی کی پوشاک میں وہ بے حد شگفتہ شاداب، تروتازہ، روشن چہرہ

اور اف خدا! ایک آج کا چہرہ: بالکل پژمردہ، بجھا ہوا، بے بسی کا شکار۔ چہرہ الگ سے کسی وجود کا حامل نہیں ہوتا ہے۔ اصل شے روح کی تازگی ہوتی ہے۔ چہرہ صاف شفاف اور شیریں آب ہے اور روح اس کا منبع۔ دراصل چہرہ ایک کتاب ہے۔ اس میں درد دل درج ہے۔ زندگی کی داستاں رقم ہے۔ چہرہ آئینہ ہے حال دل کا۔ بھائی اب امیدوں کا مرکز نہیں رہا۔ اس کے بازو تھک چکے ہیں۔ آسمان کی وسعتیں اس سے اب دور ہو چکی ہیں۔ تارے اداس اور بے جان دکھائی دے رہے ہیں۔ اس کی آنکھوں میں رات ہی رات ہے۔ سامنے اداس جھونپڑی کھڑی ہے۔ عقب میں ایک برہنہ شجر ہے۔ اس شجر کی خاردار اور بے لباس ٹہنیوں میں زرد ماہتاب الجھ کر رہ گیا ہے۔ میرا بھائی شاید وہی زرد ماہتاب تو نہیں ہے جس کی روح صدموں کے صحرا میں چیخ چیخ کر صدا دے رہی ہے! مگر کیا یہ میرے بھائی کی تنہا چیخ ہے؟

■

اس نے سوچا کہ وہ ایسا نہیں ہونے دے گا۔ اُس وقت وہ کسی کی پرواہ نہیں کرے گا۔ وہ خود کو جذبات کے گرداب میں الجھنے نہیں دے گا اور مایوسی و فرار کی کیفیت سے خود کو آزاد رکھے گا اور پھر وہ کسی کے کہنے پر تو نہیں جا رہا ہے بلکہ وہ اپنے دروں کو لبیک کہہ رہا ہے۔ بہت ہو چکا۔ اس نے خواہ مخواہ اپنا بہت سارا وقت جذبات کا اسیر ہو کر ضائع کر دیا۔ اس نے چند اشخاص کے رویے کو اپنے دل کی گانٹھ بنا لیا تھا۔ حالانکہ اُسے اپنے ناموافق حالات کا مقابلہ کرنا چاہیے تھا اور تمام حالات کو وسیع تناظر میں دیکھنا چاہیے تھا۔ اپنے ساتھیوں کی غلط فہمی کو وہ دور کر سکتا تھا۔ بہر حال اس نے فیصلہ کیا کہ اس طرح سماج سے لاتعلق ہو کر جینا مناسب نہیں ہے۔ جہاں تک اس کے حالات اجازت دیں گے، جب تک اس کی قوت اس کا ساتھ دے گی، وہ اپنی سماجی افادیت کو برقرار رکھے گا اور زندگی کے مجادلے میں ضرور حصہ لے گا۔ افکار کے نشیب و فراز سے گزرتا ہوا وہ ٹاؤن ہال میں پہنچا۔ وہاں لوگ یکجا ہو رہے تھے۔ چند پرانے شناساؤں سے بھی اس کا سامنا ہوا۔ لیکن کسی نے اس پر توجہ نہ کی۔ پھر بھی وہ اس بات سے ذرا بھی دل گرفتہ نہیں ہوا بلکہ اس نے اپنی قوت کو مجتمع کیا اور صف کے آخر میں جا کھڑا ہوا۔ ریلی نے بہت دیر تک گشت لگائی۔ شناسا سڑکیں اور گلیاں اس کی نظروں کے سامنے سے ایک بار پھر گزرتی رہیں۔ وہ مکمل اعتماد کے ساتھ آخری لمحوں تک ریلی کے ساتھ بڑھتا رہا اور ہر قدم پر اُسے ایک نئی زندگی کا لطف ملتا گیا۔

سنچیوری پبلیکیشنز